خول در خول
اشتیاق احمد

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

محمود، فاروق، فرزانہ اور انسپکٹر جمشید سیریز ۹۵

خول در خول

اشتیاق احمد

حدیث شریف: عمرو بن شعیبؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اپنے بچوں کو نماز کی تاکید کرو جبکہ وہ سات برس کے ہوں اور نماز کے چھوڑنے پر ان کو مارو، جب کہ ان کی عمر دس سال کی ہو جائے اور انہیں الگ الگ بستر پر سلاؤ۔

ناول پڑھنے سے پہلے

یہ دیکھیں کہ:

- یہ وقت نماز کا تو نہیں۔
- آپ کو سکول کا کام تو نہیں کرنا۔ کل آپ کا کوئی ٹسٹ یا امتحان تو نہیں۔
- گھر والوں نے آپ کے ذمّے کوئی کام تو نہیں لگا رکھا؟
- آپ نے کسی کو وقت تو نہیں دے رکھا؟

اگر ان باتوں میں سے کوئی بھی بات ہو تو ناول الماری میں رکھ دیں۔ پہلے نماز اور دوسرے کاموں سے فارغ ہو لیں پھر ناول پڑھیں۔ شکریہ!

مخلص
اشتیاق احمد

بھیانک منظر

"کچھ خبر بھی ہے، ہم بہت دُور نکل آئے ہیں، اب واپس چلنا چاہیے۔" محمود نے قدم روکتے ہوئے کہا۔

"تو کیا ہوا، آج کون سا امّی جان اور ابّا جان سے واپسی پر ملاقات ہوگی۔ وہ تو صبح تک واپس پہنچیں گے۔" فاروق نے رکے بغیر کہا اور محمود سے چند قدم آگے نکل گیا۔

"لیکن یہ تو سوچو، فرزانہ گھر میں تنہا ہے، وہ فکرمند ہوگی۔" محمود بھنا اٹھا۔ آج نہ جانے کیوں فاروق پر سیر کا بھوت سوار تھا۔

"ہونے دو، تھوڑی بہت فکر صحت کے لیے مضر نہیں ہوتی۔" فاروق مسکرایا۔

"اچھا چلو، میں بھی دیکھتا ہوں، تم کتنے سیر کرنے والے ہو۔" محمود نے جھنجلا کر کہا۔

"یہ کتنے سے تمہاری کیا مراد ہے؟" فاروق نے شوخ لہجے میں کہا۔

"پتا نہیں، ایک تو تمہیں ہر بات کی مراد جاننے کی پڑی رہتی ہے۔" محمود بولا۔

"آج تو فرزانہ کی کمی پوری کرتے نظر آ رہے ہو۔" فاروق کے لہجے میں حیرت تھی۔

"کیا مطلب؟" محمود بوکھلا کر بولا۔

"میرا مطلب ہے، انگارے چباتے میں اسے بھی دو ہاتھ پیچھے چھوڑ رہے ہو۔" فاروق نے فوراً کہا۔

"یہ ہم پارک کا صرف تیسرا چکر لگا رہے ہیں۔ آخر کیا نظر آ گیا ہے، اس میں تمہیں۔"

"پھول، پودے، درخت، یہ خوش و خرم بچے۔ کیا یہ کچھ کم اہم چیزیں ہیں۔" فاروق نے ہاتھ سے اشارا کیا، چہرے پر شریر مسکراہٹ ناچ رہی تھی۔

"یہ چیزیں تو یہاں ہر روز ہی ہوتی ہیں۔"

"لیکن آج یہ کچھ زیادہ ہی نکھری نکھری لگ رہی ہیں۔ شاید اس لیے کہ کل خوب بارش ہوئی تھی۔ انہوں نے خوب غسل کیا ہے۔"

"اب میں سمجھا، آج تم میں کسی شاعر کی روح حلول کر گئی ہے۔" محمود بھی مسکرایا۔

"ارے باپ رے۔" فاروق بوکھلا اٹھا۔

"کیوں، کیا بات ہے۔ خیر تو ہے؟" محمود حیران رہ گیا۔

"اف خدا، ضرور یہی بات ہے۔ میں بھی کہوں، میں خود کو بدلا بدلا کیوں محسوس کر رہا ہوں۔ بات دراصل یہ ہے کہ رات شاگل فرقانی سے ملاقات ہو گئی تھی۔ میں نے بہت دیر تک ان کا کلام سنا تھا۔ ضرور یہ اسی کا اثر ہے اور کیا خبر، فرقانی صاحب کی روح واقعی میرے اندر گھس گئی ہو۔ مہربانی فرما کر مجھے جلد از جلد گھر لے چلو۔" اس نے بوکھلائے ہوئے انداز میں کہا۔

"یار، کیوں مذاق کرتے ہو۔ رات تو تم عشا کی نماز کے فوراً بعد ہی سو گئے تھے، پھر شاگل فرقانی سے ملاقات کیسے کر لی۔ جب کہ تمام رات میں بھی اسی کمرے میں سویا رہا اور صبح میں نے ہی تمہیں جگایا تھا۔"

"اف، یہی تو تم سمجھتے نہیں۔ ارے میاں، میں رات بھر ان کا کلام خواب میں سنتا رہا۔"

"اوہ۔" محمود کے منہ سے نکلا، پھر اس نے حیران ہو کر کہا۔

"لیکن یہ شاگل فرقانی صاحب ہیں کون؟"

"لو اور سنو، اتنا بھی معلوم نہیں۔ لاحول ولا قوۃ، بھئی بہت بڑے شاعر ہیں۔ اس وقت ان کا شاعری میں کوئی مقابل نہیں، کیا خوب لکھتے ہیں۔"

"حیرت ہے، میں تو پہلی مرتبہ ان کا نام تمہاری زبان سے سن رہا ہوں۔ تمہاری ان سے ملاقات کب ہوئی تھی اور کہاں؟"

محمود بولا.

"حد ہوگئی، تم اتنا بھی نہیں سمجھتے — ارے بھئی، رات خواب میں ہی تو پہلی بار ملاقات ہوئی تھی اور انہوں نے اپنا تعارف مجھ سے کرایا تھا۔" فاروق نے شوخ لہجے میں کہا۔

"دھت تیرے کی۔" محمود نے جھلا کر ران پر ہاتھ مارا۔

"بس بس، میں یہی چاہتا تھا — آؤ واپس چلیں، سیر پوری ہوگئی۔"

"یہ یکایک سیر کس طرح پوری ہوگئی؟"

"جب تک تم جھنجلا کر ران پر ہاتھ نہ مار لیتے، میں آگے ہی بڑھتا چلا جاتا۔ آج یہی سوچ رکھا تھا۔" فاروق نے کہا۔

"تب — تب تو خدا کا شکر ہے کہ میں نے ہاتھ مار دیا۔" محمود نے خوش ہو کر کہا۔

دونوں پارک سے نکل کر سڑک پر آگئے — یہ پارک کی عقبی سڑک تھی اور ایک چکر کاٹ کر وہ پارک کے صدر دروازے پر پہنچ سکتے تھے، جہاں ان کی موٹر سائیکل موجود تھی۔ یہ راستا انہوں نے اس لیے اختیار کیا کہ لوگ انہیں نہ گھوریں — پہلے ہی تین چکر لگانے کی وجہ سے کچھ لوگ انہیں بار بار گھور رہے تھے۔ شاید وہ سوچ رہے تھے کہ یہ دونوں لڑکے ضرور کسی چکر میں ہیں۔ ہو سکتا ہے، یہ جیب کترے ہوں۔

اچانک محمود کو اپنے پیچھے خطرے کا ایک انجانا سا احساس ہوا۔ اس نے جلدی سے فٹ پاتھ پر چھلانگ لگا دی اور ساتھ ہی فاروق کا ہاتھ پکڑ کر جھٹکا مارا — دونوں لڑکھڑا گئے اور ٹانگیں آپس میں الجھ جانے کی وجہ سے بے ڈھب انداز میں فٹ پاتھ پر گرے، لیکن یہ گرنا ہی انہیں بچا گیا۔

عین اسی وقت فضا میں ایک ہولناک چیخ بلند ہوئی اور ایک کار زوں کر کے فٹ پاتھ سے رگڑ کھاتی گزر گئی۔ وہ دہشت زدہ انداز میں مڑے اور پھر انہوں نے ایک ہولناک منظر دیکھا۔

⦿

وہ تو فٹ پاتھ پر گرنے کی وجہ سے بال بال بچ گئے تھے، لیکن ان کے بالکل پیچھے آنے والا شخص کار کی زد میں آگیا تھا۔ آنکھوں سے اوجھل ہوتی ہوئی کار پر ایک نظر ڈالتے ہوئے انہوں نے پھر پیچھے کی طرف دیکھا اور کانپ گئے — اگر محمود کو صرف ایک سیکنڈ پہلے خطرے کا احساس نہ ہو جاتا تو اس وقت وہ بھی بالکل اسی طرح سڑک پر پڑے ہوتے، جس طرح وہ شخص۔ اس کا سر بالکل پھٹ گیا تھا اور اس سے بہنے والا خون بہت تیزی سے آس پاس کی زمین کو رنگین بنا رہا تھا۔ اس کے

جسم میں ایک جھرجھری پیدا ہوئی۔ اور پھر وہ بے حس ہو گیا ـــــ
کار اس کے اوپر سے گزر گئی تھی۔ اس کے سینے سے بھی کئی
جگہوں سے خون پھوٹ نکلا تھا۔ شاید پسلیاں ٹوٹ گئی تھیں۔

"اف خدا، یہ ـ یہ بے چارہ ہماری وجہ سے مارا گیا۔" فاروق
نے تھرتھر کانپتی آواز میں کہا۔

"ہاں، اس کی موت کا منظر ہم زندگی بھر نہیں بھولیں گے۔"
محمود بڑبڑایا۔

راہگیر لاش کے گرد جمع ہونے لگے ـ انہوں نے جلدی سے
چاروں طرف دیکھا، پھر محمود نے بلند آواز میں کہا:

"مہربانی فرما کر نزدیک نہ آئیں ـ کوئی صاحب پولیس کو فون
کر دے۔"

اس کی بات جیسے کسی نے سنی ہی نہیں ـ آخر اس نے
فاروق سے کہا:

"فاروق، تم ہی کسی دکان سے فون کر آؤ۔ میں یہیں ٹھہرتا
ہوں۔"

"اچھی بات ہے۔" فاروق نے کہا اور مجمعے کو چیرتا ہوا نکل
گیا، لیکن پھر اس کے قدم رک گئے ـ سڑک کے دوسرے کنارے
چمڑے کے کیس میں بند کوئی چیز پڑی تھی۔ یہ مستطیل سی تھی اور
تسمہ بھی نظر آ رہا تھا ـ غیر ارادی طور پر اس کے قدم اس چیز

کی طرف اٹھنے لگے۔ نزدیک پہنچنے پر اس نے دیکھا، وہ ایک
کیمرا تھا ـ اس نے چند سیکنڈ کے لیے سوچا، پھر کیمرا اٹھا لیا اور
اسے کندھے سے لٹکا کر آگے بڑھا۔

فون کی تلاش میں اسے کافی دور جانا پڑا، کیونکہ ان اطراف
میں دکانیں بہت دور دور تھیں۔ آخر ایک بہت بڑی دکان نظر
آئی۔ اس کے بورڈ پر لکھا تھا، شہر بھر میں سب سے زیادہ مناسب
نرخوں والی دکان ـ دکان میں گاہکوں کا ہجوم دیکھ کر فاروق کو حیرت
ہوئی کہ اس غیر آباد سی جگہ اتنے گاہک کہاں سے آ گئے۔ دکان
کے باہر کاروں کی بہت لمبی لائن لگی تھی؛ گویا کاروں والے سب
یہیں خریداری کرنے آئے تھے ـ جونہی وہ دکان میں داخل ہوا،
دائیں ہاتھ کاؤنٹر پر بیٹھے ایک شخص نے فوراً کہا:

"کیا آپ کو کیمرے کے لیے فلم چاہیے، سیدھے چلے جائیے۔
آخری سیل مین فوٹوگرافی سے تعلق رکھتا ہے۔"

"شکریہ جناب، مجھے تو صرف ایک فون کرنا ہے ـ ایک شخص
ایک کار کے نیچے آ کر کچلا گیا اور بے چارہ بالکل بے گناہ۔" فاروق
بولا۔

"اوہو، اچھا، کہاں پر؟"

"پارک کے پچھلے دروازے کی طرف ـ کیا میں فون کر سکتا ہوں؟"

"ہاں ضرور، کیوں نہیں۔" اس نے خوش اخلاق مسکراہٹ چہرے

پر لاتے ہوئے کہا۔
"شکریہ جناب"۔
فاروق نے کیمرا کاؤنٹر پر رکھا اور نمبر گھمانے لگا۔ اسی وقت اس نے کاؤنٹر والے کے چہرے پر حیرت کے آثار دیکھے، لیکن اس سے پہلے کہ وہ اس سے حیرت کی وجہ معلوم کر سکتا، سلسلہ مل گیا۔
"ہیلو، پولیس سٹیشن پارک وے"۔
"یہاں پارک کے پچھلے دروازے کے پاس ایک حادثہ ہو گیا ہے۔ ایک شخص ایک کار کے نیچے کچلا گیا ہے ـــ میرا نام فاروق احمد ہے ـــ میں جائے حادثہ کے پاس موجود ہوں گا"۔
"کیا کہا، کچلا گیا ہے؟ کیا وہ بالکل مر چکا ہے؟" پولیس سٹیشن سے پوچھا گیا۔
"جی بالکل کے بارے میں تو ڈاکٹر ہی بتائے گا۔ بظاہر وہ مر چکا ہے۔" اس نے جواب دیا۔
"اوہ، آپ وہیں ٹھہریں ـــ حادثے کی تفصیلات بھی آپ سے پوچھنا ہوں گی۔" دوسری طرف سے کہا گیا۔
"ضرور جناب، فکر نہ کریں۔" فاروق نے مسکرا کر کہا اور ریسیور رکھ دیا۔ کیمرا اٹھاتے ہوئے اس نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور ایک روپے کا نوٹ نکال کر کاؤنٹر پر رکھ دیا۔

"نہیں جناب، اس کی ضرورت نہیں ـــ آپ نے تو فون کرکے اپنا فرض ادا کیا ہے۔"
"بہت اچھا۔" یہ کہہ اس نے روپیہ اٹھا کر جیب میں رکھ لیا اور جانے کے لیے مڑا ـــ دراصل وہ چاہتا تھا، دکاندار حیرت کی وجہ خود ہی بتائے اور دکاندار اسے مڑتے دیکھ کر رہ نہ سکا۔
"سنیئے جناب، یہ کیمرا......" اس سے آگے وہ کچھ نہ کہہ سکا۔
"جی ہاں، یہ کیمرا ہی ہے اور میں اس کے لیے فلم لینے نہیں آیا تھا۔ میں تو صرف پولیس کو حادثے کی اطلاع دینے آیا تھا۔" اس نے جلدی سے کہا۔
"جی ہاں، جی ہاں، وہ تو میں سمجھتا ہوں ـــ کہنے کا مطلب یہ تھا کہ کیا یہ کیمرا آپ کا ہے؟"
"آپ نے یہ سوال کیوں پوچھا؟" فاروق نے حیران ہو کر کہا۔
"بس ایسے ہی ـــ میرا خیال ہے، یہ کیمرا آپ کا نہیں ہے۔" اس نے کہا۔
"آپ یہ بات کس طرح کہہ سکتے ہیں؟"
"اس لیے کہ اس کیمرے کو میں اچھی طرح جانتا ہوں ـــ ایک زمانے سے اسے دیکھتا چلا آ رہا ہوں۔ اس کیمرے کا مالک ہمیشہ ہم سے فلم خریدتا رہتا ہے ـــ ارے ہاں، وہ تو آج بھی آیا تھا۔" یہ کہتے کہتے اس نے ایک بٹن دبا دیا۔ فاروق نے غیر ارادی طور پر

آخری سیلز مین کی طرف دیکھا — وہ کاؤنٹر کی طرف آ رہا تھا۔

"یس سر!" اس نے کاؤنٹر والے سے باادب ہو کر کہا۔

"یہ کیمرا مسٹر ٹونی کا ہی ہے نا؟"

"ارے، یہ کیمرا ان کے پاس کہاں سے آ گیا — آپ کا خیال بالکل ٹھیک ہے مسٹر داؤد۔"

"میں انہیں بتا رہا تھا کہ اس کیمرے کا مالک ہمارا بہت پرانا گاہک ہے — ایک زمانے سے وہ ہم سے فلمیں خرید رہا ہے۔"

"بالکل ٹھیک سر، مسٹر ٹونی نے تو آج بھی ابھی ابھی فلم ڈلوائی ہے۔" سیل مین کے لہجے میں حیرت تھی۔

"اسی لیے اس کیمرے کو ان کے ہاتھ میں دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی تھی۔ کیا آپ بتانا پسند کریں گے، یہ کیمرا آپ نے کہاں سے لیا؟" ان الفاظ کے ساتھ ہی مسٹر داؤد نے غیر محسوس طور پر ایک بٹن اور دبایا، لیکن یہ چیز بھی فاروق کی تیز نظروں سے چھپی نہ رہ سکی۔

"کیا آپ مجھے چور سمجھ رہے ہیں؟" فاروق نے بھنا کر کہا۔

"ارے نہیں جناب، بالکل نہیں —— لیکن ہماری حیرت بھی تو بالکل بجا ہے جناب۔" داؤد نے جلدی سے کہا۔

"ہاں، یہ بھی ٹھیک ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ..... اس

کے الفاظ درمیان میں رہ گئے۔ اسی وقت ایک لمبے قد کا آدمی کاؤنٹر پر پہنچتے ہوئے بولا:

"یس سر، میں حاضر ہوں۔"

"یہ ہماری دکان کے جاسوس ہیں جناب، اور مسٹر سابی، یہ صاحب ہماری دکان پر پولیس کو ایک حادثے کی اطلاع دینے آئے تھے۔ فون کرنے سے پہلے انہوں نے یہ کیمرا کاؤنٹر پر رکھا۔ میں اس کیمرے کو بخوبی پہچانتا ہوں — یہ ہمارے بہت پرانے گاہک مسٹر ٹونی کا ہے، اس لیے یہ ہمارا فرض بنتا ہے کہ ان سے معلوم کریں، یہ کیمرا ان کے پاس کہاں سے آیا۔ اپنے گاہک کی بہتری کا خیال رکھنا ہمارا فرض ہے۔" مسٹر داؤد نے جلدی جلدی کہا۔

"یہ جان کر بے پناہ خوشی ہوئی کہ آپ اپنے گاہک کا اس قدر خیال رکھتے ہیں — آپ اپنے جاسوس مسٹر سابی کو میرے ساتھ بھیج دیجیے۔ میں ان کا اطمینان کرا دوں گا۔" فاروق نے خوش دلی سے کہا۔

"آپ مجھے کہاں لے جانا چاہتے ہیں؟" سابی نے حیران ہو کر پوچھا۔

"جائے حادثہ پر — اگر یہ کیمرا آپ کے کسی گاہک کا ہے، تو شاید اب وہ کبھی آپ کی دکان سے فلم خریدنے نہیں آ سکے

گا۔"

"کیا مطلب؟" وہ ایک ساتھ بولے۔

"مطلب یہ کہ شاید یہ کیمرا اس شخص کا ہے، جسے کار کچل گئی ہے۔ یہ مجھے لاش سے کچھ ہی فاصلے پر پڑا ملا ہے اور اب یہ پولیس کے حوالے کیا جا سکتا ہے، آپ کے نہیں، لہذا آپ کے جاسوس اپنا اطمینان کرنے کے لیے میرے ساتھ چل سکتے ہیں۔"

"ضرور سر، کیوں نہیں۔ چلیے جناب۔"

دونوں جائے حادثہ پر پہنچے۔ محمود کے چہرے پر غصے کے آثار نظر آئے۔ شاید اسے تماشائیوں نے بہت پریشان کر رکھا تھا۔

"کہاں رہ گئے تھے؟"

"فون نزدیک سے نہیں ہو سکا۔" اس نے منہ بنایا، ادھر سابی کی نظریں لاش پر جمی تھیں۔ اچانک اس نے کہا۔

"اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ مسٹر ٹونی ہی ہیں۔ افسوس، ہماری دکان ایک اچھے گاہک سے ہاتھ دھو بیٹھی۔" یہ کہہ کر وہ مڑا اور واپس چلا گیا۔

"یہ بے چارہ تو اپنی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھا۔" فاروق سرد آہ بھر کر بولا۔

دس منٹ بعد پولیس آ پہنچی۔ سب انسپکٹر اور اس کے ماتحت انہیں اچھی طرح پہچانتے تھے۔

"او ہو، آپ لوگ بھی موجود ہیں۔" اس کے منہ سے نکلا۔

"اگر ہم یہاں موجود نہ ہوتے تو یہ بے چارہ کیوں مارا جاتا۔" محمود بولا۔

"کیا مطلب؟" سب انسپکٹر نے چونک کر کہا

"کار کا نشانہ دراصل ہم تھے، زد میں یہ غریب آ گیا۔"

"اوہ، تو کار والا آپ کو کچلنا چاہتا تھا۔"

"ہم یقین سے نہیں کہہ سکتے کہ اس میں ایک آدمی تھا یا زیادہ، لیکن اس میں ایک فیصد بھی شک نہیں کہ وہ ہمیں کچلنا چاہتے تھے۔" محمود نے کہا۔

"تب تو یہ حادثہ اور بھی افسوس ناک ہو گیا ہے۔" سب انسپکٹر نے کہا۔

"جی ہاں، اس سے بھی کچھ زیادہ۔ ہمیں رہ رہ کر اس کے گھر والوں کا خیال آ رہا ہے، ہم کس طرح انہیں یہ خوف ناک اطلاع دے سکیں گے۔ شاید یہ عیسائی تھا۔" فاروق بول پڑا۔

"یہ آپ کس طرح کہہ سکتے ہیں؟" سب انسپکٹر نے حیران ہو کر کہا۔ محمود بھی اسے گھورنے لگا۔

"میں اس کیمرے کی مدد سے اسے عیسائی کہہ سکتا ہوں۔" یہ

کہہ کر اس نے دکان اور دکان کے عملے کے بارے میں بتایا۔

"تو اس کا نام ٹونی ہے۔ ٹھہریے، پہلے اس کی تلاشی تو لے لیں۔ شاید نام پتا وغیرہ مل جائے۔" یہ کہہ کر سب انسپکٹر لاش پر جھک گیا۔ تلاشی پر کئی چیزیں ہاتھ لگیں۔ ان میں دکان کی طرف سے ملنے والی رسید بھی تھی، جو آج ہی کی تاریخ کی تھی۔ بٹوے میں سو سو روپے کے بہت سارے نوٹ بھی تھے؛ گویا یہ شخص کوئی غریب آدمی نہیں تھا۔ شناختی کارڈ بھی موجود تھا، جس پر گھر کا پتا درج تھا۔ محمود نے جلدی جلدی گھر کا پتا نوٹ کیا اور پھر کیمرا کھول کر دیکھا۔ اس میں فلم بالکل نئی چڑھی ہوئی تھی۔ گویا اس فلم سے ابھی کوئی تصویر نہیں لی گئی تھی۔

"لیجیے جناب کیمرا بھی آپ ہی سنبھالیے۔ ہم تو چلے اس غریب کے گھر۔ آپ کو تو کارروائی مکمل کرنے میں کافی دیر لگ جائے گی۔"

"جی ہاں، یہ تو ہے۔" اس نے کہا اور کیمرا لے لیا۔

دونوں پارک کے صدر دروازے کی طرف آئے۔ وہاں سے موٹر سائیکل لی اور ٹونی کے گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔ اس کا گھر عیسائیوں کی آبادی میں تھا۔ گھر تلاش کرنے میں انہیں کوئی دقت نہیں ہوئی۔ ٹونی کافی مشہور آدمی تھا۔ اس کا گھر بھی نیا اور شاندار تھا۔ دروازے کی گھنٹی بجاتے ہوئے ان کے دل دھک دھک کرنے لگے، لیکن ایک منٹ گزرنے پر بھی کوئی اندر سے نہ نکلا، پھر گھنٹی بجائی۔

اتنے میں ایک آدمی گلی میں سے گزرا۔ اس نے انہیں گھور کر دیکھا، پھر بولا:

"کیا آپ مسٹر ٹونی سے ملنا چاہتے ہیں۔ وہ اس وقت گھر میں نہیں ملیں گے۔ وہ تو رات گئے گھر آتے ہیں۔"

"جی نہیں، ہم ان کے گھر کے افراد میں سے کسی سے بھی مل سکتے ہیں۔" محمود بولا۔

"آپ ایسا نہیں کر سکتے۔" اس نے نفی میں سر ہلایا۔

"جی، کیا مطلب۔ کیسا نہیں کر سکتے ہم؟" فاروق نے حیران ہو کر کہا۔

"مسٹر ٹونی اس دنیا میں بالکل تنہا ہیں۔ نہ ان کا آگے کوئی نہ پیچھے۔"

"اوہ۔" ان کے منہ سے ایک ساتھ نکلا اور دلوں پر سے بھاری بوجھ ہٹتا محسوس ہوا۔

"اس صورت میں تو شاید ہمیں پولیس کی موجودگی میں اندر داخل ہونا پڑے گا۔"

"کیا مطلب؟" وہ شخص چونک کر بولا۔

"مسٹر ٹونی ایک حادثے کا شکار ہو گئے ہیں۔ وہ کار کے نیچے کچلے گئے ہیں۔ ہم یہی اطلاع ان کے گھر والوں کو دینے آئے تھے۔"

"اوہو، یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔" اس کے منہ سے خوفزدہ انداز میں نکلا اور پھر ان کے گرد بہت سے لوگ جمع ہو گئے۔ انہیں بار بار حادثے کی تفصیلات بتانا پڑیں، پھر جان چھڑا کر وہاں سے ہٹ آئے — پولیس کی موجودگی میں اس گھر میں وہ صبح ہی داخل ہو سکتے تھے۔ اب یہ ان کا فرض ہو گیا تھا کہ گھر میں داخل ہو کر ٹونی کے کاغذات وغیرہ دیکھتے، تاکہ معلوم ہوتا، اس کی وصیت کیا ہے اور پھر اس کی وصیت پر عمل کیا جاتا۔ تنہا آدمی عام طور پر اپنی دولت وغیرہ مسجدوں یا مذہبی اداروں کے نام کر جاتے ہیں — ٹونی عیسائی تھا تو اس نے کسی گرجا کے نام کر رکھی ہوگی۔ لیکن یہ چیز کاغذات دیکھنے پر ہی معلوم ہو سکتی تھی۔

سڑک پر پہنچ کر انہوں نے اس علاقے کے پولیس سٹیشن فون کیا۔ محمود نے اپنا تعارف کرانے کے بعد صورتِ حال بتائی — پولیس افسر نے اسی وقت پہنچنے کا وعدہ کیا۔ دونوں کو انتظار کرنا پڑا۔

پندرہ منٹ بعد ایک سب انسپکٹر دو کانسٹیبلوں کے ساتھ وہاں پہنچ گیا — انہوں نے پہلے تو ان سے ہاتھ ملائے، پھر تفصیل پوچھی۔

"تو اب آپ ٹونی کی وصیت دیکھنا چاہتے ہیں، تاکہ اگر اس کا کوئی وارث ہو تو اس کا مکان اور نقدی وغیرہ اس کے

حوالے کر دی جائے۔ یا پھر وصیت کے مطابق کسی گرجا کو دے دی جائے۔" سب انسپکٹر نے کہا۔

"جی ہاں، بالکل یہی بات ہے۔"

"تو ٹھیک ہے، ہم تالا توڑ دیتے ہیں، لیکن اس کے لیے کسی مجسٹریٹ کی ضرورت ہوگی — خیر میں بندوبست کرتا ہوں۔" سب انسپکٹر نے کہا۔

آخر مجسٹریٹ کی موجودگی میں وہ اندر داخل ہوئے۔ گھر کے اندر بے ترتیبی کے آثار نظر آئے — شاید ٹونی کوئی بھی چیز اپنی جگہ پر رکھنے کا عادی نہیں تھا — ایک کمرے کے علاوہ ہر کمرے گرد کی تہیں جمی نظر آئیں؛ گویا جو کمرہ وہ اپنے استعمال میں رکھتا تھا، وہی صاف کر لیتا تھا — باورچی خانے میں بھی برتن گندے پڑے تھے — انہوں نے اپنا کام شروع کیا، لیکن وصیت کی قسم کے کاغذات پورے گھر میں کہیں نہ ملے؛ البتہ الماریوں سے دو مختلف بنکوں کی چیک بکیں ضرور ملیں؛ گویا ٹونی کا اکاؤنٹ دو بنکوں میں تھا — الماریوں میں بے شمار تصاویر بھری تھیں۔ ان میں مختلف قسم کی تصاویر تھیں۔ انہیں دیکھ کر یہ اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ ٹونی راستہ چلتے بھی تصویریں اتار لینے کا عادی تھا، یعنی راہگیروں کی تصویریں — فٹ پاتھوں پر بیٹھے مزدور پیشہ لوگوں کی تصویریں — دکانداروں کی تصویریں — یہ تمام تصاویر ایسے ہی لوگوں کی تھیں۔

گھر میں کوئی کام کی چیز نہ پا کر وہ باہر نکل آئے۔

تھکے تھکے سے وہ واپس لوٹے تو فرزانہ کی آنکھیں شعلے اگل رہی تھیں۔

حملہ

انسپکٹر جمشید اور بیگم جمشید شادی والے گھر سے رخصت ہوئے اور جیپ میں بیٹھ کر واپس روانہ ہوئے ہی تھے کہ سڑک کے کنارے ایک شخص کھڑا نظر آیا — اس نے لفٹ لینے کے انداز میں ہاتھ اوپر اٹھا رکھا تھا۔ انہوں نے جیپ اس کے قریب روک لی۔

"جی فرمائیے۔"

"آپ دارالحکومت جا رہے ہیں؟" اس نے پوچھا۔

"جی ہاں، جا تو دارالحکومت ہی رہے ہیں۔" انہوں نے کہا۔

"اگر آپ مجھے راستے میں ہی ایک جگہ اتار دیں تو بہت مہربانی ہوگی۔ میری گاڑی خراب ہو گئی ہے۔" اس نے کچھ فاصلے پر سڑک کے کنارے کھڑی کار کی طرف اشارا کیا۔ انہوں نے کار کی طرف دیکھا، پھر بولے:

"ٹھیک ہے، تشریف رکھیے۔"

"بہت بہت شکریہ جناب۔" یہ کہہ کر وہ جیپ کے پچھلے حصے

میں سوار ہو گیا اور انسپکٹر جمشید نے جیپ آگے بڑھا دی۔

ایک دور کے رشتے دار کی شادی میں شرکت کے لیے آئے تھے اور رات گئے گھر لوٹ رہے تھے۔ صبح تک وہ گھر پہنچ جاتے۔ انہیں چونکہ کوئی جلدی نہیں تھی' اس لیے مناسب رفتار سے جیپ چلا رہے تھے۔ ٹھیک دو گھنٹے بعد پیچھے سے آواز آئی :

"بہت بہت شکریہ جناب ۔ سامنے جو پہاڑی آ رہی ہے' اس کے سامنے مجھے اتار دیجیے گا ۔"

"اچھا ۔" انہوں نے کہا اور جیپ کی رفتار اور کم کر دی' پھر پہاڑی کے بالکل سامنے روک دی۔

"بہت بہتر مہربانی جناب ۔" اس نے نیچے اترتے ہوئے کہا۔

"لیکن یہاں تو آس پاس کسی آبادی کے آثار نہیں۔ آپ یہاں کیوں اتر گئے ۔" انسپکٹر جمشید کے لہجے میں حیرت تھی۔

"اس پہاڑی کے پیچھے میرا کیمپ ہے۔ دراصل میں نے اس پہاڑی کو توڑنے کا ٹھیکا لے رکھا ہے۔ بارود کے ذریعے اسے پتھروں میں تبدیل کیا جاتا ہے ۔"

"اوہ' تو یہ بات ہے ۔"

"جی ہاں' لیکن اگر میرا نائب اس وقت یہاں نہ ہوا تو پھر مجھے دارالحکومت ہی جانا ہو گا ۔"

"اور یہاں سے آپ دارالحکومت کس طرح جائیں گے ۔" انسپکٹر جمشید

حیران ہو کر بولے۔

"کوئی گاڑی آ ہی جائے گی ۔" اس نے فکرمند ہو کر کہا۔

"آپ پہاڑی تک ہو کر کتنی دیر میں آ سکتے ہیں ؟" انسپکٹر جمشید بولے۔

"کیوں جناب' آپ یہ کیوں پوچھ رہے ہیں ؟"

"میں آپ کا انتظار کیے لیتا ہوں۔ اگر آپ کے نائب نہ ملیں تو آ جائیے گا' ورنہ وہیں سے آواز دے دیجیے گا ۔"

"آپ' آپ اس صدی کے انسان تو لگتے نہیں۔ آج کل اتنے ہمدرد لوگ کہاں ۔"

"ارے نہیں بھئی' میں اسی دنیا میں ایک معمولی سا آدمی ہوں' آپ جائیے ۔"

اور وہ سڑک سے اتر کر پہاڑی کی طرف چل پڑا۔ وہ اس کی طرف دیکھتے رہے۔ انہوں نے اسے ٹارچ روشن کرتے دیکھا۔ انسپکٹر جمشید یک دم جیپ سے اتر آئے۔

"تم بھی نیچے اتر آؤ بیگم' جلدی کرو ۔" انہوں نے بوکھلائی ہوئی آواز میں کہا۔

"کیوں' کیا ہوا ؟" وہ نیچے اترتے ہوئے بولیں۔

انہوں نے جواب دینے کی بجائے ان کا ہاتھ پکڑا' سڑک سے نیچے اتر گئے۔ ان کا رخ پہاڑی کی مخالف سمت میں تھا۔ اچانک

ایک کان پھاڑ دینے والا دھماکا ہوا ۔ دونوں منہ کے بل زمین پر
گرے ۔

چند منٹ دھماکے کے اثر سے نکلنے میں لگ گئے ۔ آخر
انسپکٹر جمشید سر اوپر اٹھانے کے قابل ہو ہی گئے ۔ سڑک پر
نظر ڈالتے ہی وہ کانپ اٹھے ۔

" بیگم کس حال میں ہو " انہوں نے دھیرے سے پکارا ۔ بیگم
جمشید کے جسم میں حرکت پیدا ہوئی ۔

" یہ ۔ یہ کیا ہوا تھا ؟ " وہ بولیں ۔

" دھماکا ، بم کا دھماکا ۔ سڑک کی طرف دیکھو ۔ تھوڑی دیر
پہلے وہاں سڑک پر ہماری جیپ موجود تھی ۔ ہم بھی جیپ میں تھے ،
لیکن اب ہماری جیپ کہیں بھی نظر نہیں آ رہی " انہوں نے کھوئے
کھوئے انداز میں کہا ۔

" اف خدا ، تت ۔ تت ۔ تو کیا ..... ؟ " بیگم جمشید کپکپا اٹھیں ۔

" ہاں بیگم ، جیپ کے پرخچے اڑ گئے ہیں "

" ل ، لیکن کیوں ؟ ایسا کیوں کیا گیا ؟ " وہ بولیں ۔

" یہ ضرور ہمارے کسی دشمن کا کام ہے ۔ جیپ میں جس
شخص نے لفٹ لی ، وہ دشمن کا ساتھی ۔ اس نے پروگرام کے
مطابق ہماری جیپ میں لفٹ لی تھی ۔ اس پہاڑی کے بالکل سامنے
رکنے کا پروگرام پہلے ہی سے تھا اور ہمیں روکے رکھنے کے لیے

یہ ایک بہانا تھا کہ وہ اپنے نائب کو دیکھ آئے "

" لیکن سب سے عجیب بات تو یہ ہے کہ آپ کو خطرے
کا احساس کس طرح ہوگیا ۔ آپ نے مجھے جلدی سے نیچے اتر
آنے کے لیے کہا تھا "

" ایک جاسوس کی حس بہت تیز ہوتی ہے ۔ اس کی نظریں
بھی بہت دور تک دیکھ لیتی ہیں ۔ تم دیکھ رہی ہو بیگم ، آسمان
پر چودھویں کا چاند پوری آب و تاب سے چمک رہا ہے ۔ مطلع بالکل
صاف ہے ، ہر چیز بالکل صاف نظر آ رہی ہے ۔ یہاں کے درخت
ذرا بھی گھنے نہیں ہیں ، یعنی وہ بھی چاند کی روشنی کے لیے رکاوٹ
نہیں بن رہے ۔ ان حالات میں آخر اس شخص کو ٹارچ روشن کرنے
کی کیا ضرورت تھی ۔ دراصل ٹارچ سے تو وہ اپنے ساتھی یا ساتھیوں
کو اشارا دے رہا تھا کہ وہ ہمیں گھیر کر یہاں تک لانے میں کامیاب
ہوگیا ہے ۔ اب تم اپنا کام کر سکتے ہو "

" اوہ " بیگم جمشید دھک سے رہ گئیں ۔ اسی وقت انہوں نے
سڑک کی طرف سے کسی کو کہتے سنا :

" جیپ کے ٹکڑے اڑ گئے ہیں ۔ ان دونوں کے جسم بھی
فضا میں منتشر ہو چکے ہیں ، آؤ چلیں "

" خس کم جہاں پاک ، ان کا تو کانٹا نکلا " دوسری آواز سنائی
دی ۔ یہ آواز اسی شخص کی تھی ، جس نے جیپ میں لفٹ لی تھی ۔

وہ تیزی سے نیچے دبک گئے — ساتھ ہی انسپکٹر جمشید نے
جیب سے پستول نکالتے ہوئے سرگوشی کی :

"میں ان میں سے ایک کو بھی نہیں چھوڑوں گا :"

"لیکن کیا یہ بہتر نہیں ہوگا کہ اس وقت آپ خاموش ہی
رہیں :" بیگم جمشید بھی دبی آواز میں بولیں ۔

"ہوں، تم ٹھیک کہتی ہو — آج شاید میرا دماغ سو رہا ہے،
اور اس کی بجائے تمہارا جاگ رہا ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ ہم
شہر تک کس طرح پہنچیں گے — ان لوگوں سے ٹکر لے کر ان کی
گاڑی تو ہاتھ لگ ہی سکتی ہے :" وہ بولے ۔

"کیا یہ سڑک استعمال میں نہیں رہتی ؟"

"یہ بات نہیں — خیر یونہی سہی، ہم لفٹ ہی لے لیتے ہیں،
امید ہے صبح تک شہر پہنچ جائیں گے :" وہ بولے ۔

پھر انہوں نے سڑک پر دور کہیں گاڑی کا انجن بیدار ہونے
کی آواز سنی — سر باہر نکال کر دیکھا، تین سائے ایک کار میں بیٹھ
رہے تھے ۔ دیکھتے ہی دیکھتے کار روانہ ہوگئی ۔

"ان لوگوں کو ہم سے کیا دشمنی ہو سکتی ہے :" بیگم جمشید
بڑبڑائیں —

"مجھے تو اس کے جملے نے فکر میں مبتلا کر دیا ہے، اس نے
کہا تھا، ان کا تو کانٹا نکلا — بیگم، یہ تو بہت خطرناک بات ہے :"

"کیا مطلب، یہ الفاظ کب سے خطرناک ہونے لگے ؟" بیگم
جمشید حیران رہ گئیں ۔

اب وہ سڑک کے کنارے آ کھڑے ہوئے تھے ۔ اسی وقت
دور سے ایک گاڑی آتی دکھائی دی ۔

"اس کا تو مطلب ہے، محمود، فاروق اور فرزانہ کی بھی خیر نہیں،
یہ لوگ ان پر بھی حملہ کریں گے، لیکن بیگم، اگر ہمیں اس کار میں
لفٹ مل گئی تو میں ان لوگوں سے پہلے گھر پہنچ کر دکھاؤں گا :"

"خدا کرے، لفٹ مل جائے، آپ نے تو میرے ہوش اڑا
دیے ہیں :"

"خیر ہوش اڑانے کی بھی ضرورت نہیں — محمود، فاروق اور
فرزانہ بھی کچی گولیاں نہیں کھیلے :"

اسی وقت گاڑی نزدیک آگئی — یہ ایک کار تھی اور اس
میں صرف ایک آدمی بیٹھا تھا ۔ انسپکٹر جمشید نے ہاتھ اٹھا دیا ۔ غیر
ارادی طور پر بیگم جمشید کا ہاتھ بھی اسی انداز میں اٹھ گیا — کار
ان کے قریب آ کر رک گئی ۔ سڑک پر ان کی جیپ کے ملبے میں
سے کچھ ٹکڑے ہی بچے تھے ۔ اس لیے کار کو اس مقام تک
آنے میں کوئی رکاوٹ نہیں ہوئی —

"جی فرمائیے، آپ جنگل میں کیسے کھڑے ہیں ؟" کار والے کے
لہجے میں حیرت تھی —

"ہماری جیپ تباہ ہوگئی ہے۔ ہمارے دشمنوں نے اس پر بم مارا ہے اور ہمیں دارالحکومت پہنچنا ہے۔" انہوں نے بتایا۔

"لیکن یہاں تو کوئی تباہ شدہ جیپ نہیں ہے۔" کار والا بولا۔

"بم بہت طاقت ور تھا۔ جیپ کے ٹکڑے اڑ گئے۔ آپ یہ ٹکڑے ادھر ادھر بکھرے ہوئے دیکھ سکتے ہیں۔ مہربانی فرما کر کار کی روشنیاں ادھر ادھر ڈال کر دیکھیں۔"

کار والے نے ایسا ہی کیا اور کار کی روشنی میں جیپ کے بے شمار ٹکڑے انہیں نظر آگئے۔ ان ٹکڑوں میں سے ایک ٹکڑا ایسا بھی تھا جو جیپ کا نہیں ہو سکتا تھا۔ انسپکٹر جمشید کچھ سوچ کر اس ٹکڑے کی طرف بڑھ گئے اور اسے اٹھا لیا۔ روشنی کے قریب لا کر انہوں نے اس ٹکڑے کا جائزہ لیا اور پھر چونک اٹھے۔

"اوہو، یہ تو ایک غیر ملکی بم کا ٹکڑا ہے۔ ہمارے دشمن ملک کے تیار کردہ بم کا۔"

"جی کیا مطلب؟" کار والے نے حیران ہو کر کہا۔

"یہاں ٹھہرنا خطرے سے خالی نہیں۔ پہلے آپ ہمیں کار میں بٹھائیے اور چلے چلیے۔ راستے میں ہم آپ کو سب کچھ بتا دیں گے۔"

"ٹھیک ہے، آجائیے۔" اس نے کہا۔

"بیگم، تم پچھلی سیٹ پر بیٹھ جاؤ۔" یہ کہہ کر وہ اگلی سیٹ

کی طرف بڑھے۔

"پہلے تو یہ بتائیے، آپ کی ڈرائیونگ کیسی ہے؟"

"بس ٹھیک ہی ہے، کام چلا لیتا ہوں۔"

"تو پھر ایسا کیجیے کہ کار مجھے چلانے دیجیے، کیونکہ میں اپنے بچوں کے لیے بھی خطرہ محسوس کر رہا ہوں۔"

"کار آپ کے حوالے کر دوں، لیکن جناب، میں ایسا کس طرح کر سکتا ہوں، میں نہیں جانتا، آپ کون ہیں؟" کار والا حیران ہو کر بولا۔

"یہ ٹھیک ہے، خیر یہ میرا کارڈ ملاحظہ فرمائیں۔" یہ کہہ کر انہوں نے جیب سے کارڈ نکال کر اسے دے دیا۔ جوں ہی اس نے کارڈ پر لکھا نام پڑھا، زور سے اچھلا۔

"اف خدا، آپ، یعنی کہ آپ انسپکٹر جمشید ہیں۔"

"جی ہاں، اس میں کوئی شک نہیں۔" وہ بولے۔

"مم۔ میں آپ کو بہت اچھی جانتا ہوں۔ میرا نام عرفان فوزی ہے۔ میں ایک سائنس داں ہوں، لیکن غیر معروف۔"

"آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔ میرا خیال ہے، اب آپ کو میرے کار چلانے پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔"

"قطعاً نہیں۔" یہ کہہ کر انہوں نے ڈرائیونگ سیٹ چھوڑ دی اور ساتھ والی سیٹ پر آ بیٹھے۔

اب انسپکٹر جمشید نے کار چلانا شروع کی اور رفتار بڑھاتے چلے گئے، لیکن ایک گھنٹے کی پوری کوشش کے باوجود بھی انہیں آگے کوئی کار جاتی نظر نہیں آئی۔ خدا جانے ان کے دشمن کس رفتار سے جا رہے تھے۔

"آپ نے بتایا نہیں، انہوں نے جیپ پر بم کس طرح دے مارا — اور آپ دونوں بال بال کس طرح بچ گئے، جب کہ جیپ کا کچھ بھی نہیں بچا" عرفان فوزی نے بے چین ہو کر کہا۔

"جی، جی ہاں — بات دراصل یہ ہے کہ صرف چند سیکنڈ پہلے میں نے سازش کی بُو سونگھ لی تھی اور ہم دونوں فوراً جیپ سے نیچے اتر آئے تھے۔"

"اور جیپ سرکاری تھی؟" عرفان فوزی نے پوچھا۔

"ہرگز نہیں، وہ میری اپنی جیپ تھی — اب میں نے سرکاری جیپ استعمال کرنا بالکل بند کر دیا ہے۔ ڈیوٹی کے اوقات میں بھی ذاتی گاڑی ہی چلاتا ہوں۔" یہ کہہ کر انہوں نے حادثے کی تفصیل سنا دی۔

"اس کا تو یہ مطلب ہے کہ انہوں نے آپ پر حملے کا باقاعدہ منصوبہ بنایا تھا۔" عرفان فوزی نے پریشان ہو کر کہا۔

"جی ہاں، انہوں نے معلوم کر لیا ہوگا کہ میں دارالحکومت سے اس چھوٹے سے شہر میں آیا ہوا ہوں، بس انہوں نے جھٹ پٹ

حملے کا پروگرام بنا لیا۔"

"تب تو آپ کے دشمن بہت تیز ہیں۔"

"جی ہاں، اور بم کے اس ٹکڑے سے یہ بات بھی ثابت ہے کہ ہم دشمن ملک کی سازش کا شکار ہوئے ہیں — ادھر مجھے یہ خطرہ بھی ہے کہ میرے بچوں پر بھی حملہ ہوگا — خدا ان کی حفاظت فرمائے۔"

"آمین۔" بیگم جمشید بول اٹھیں اور عرفان فوزی مسکرائے بغیر نہ رہ سکے۔

عین اسی وقت انہیں ایک گاڑی آگے جاتی نظر آئی، تاہم وہ بہت دور نظر آئی تھی — انسپکٹر جمشید جوش میں بھر گئے اور رفتار اور تیز کر دی۔

○

"ابا جان اور امی جان گھر میں نہیں ہیں، لہذا تمہیں وقت پر آنے کی کیا پڑی تھی۔" فرزانہ نے کاٹ کھانے والے لہجے میں کہا۔

"یہ بات نہیں تھی فرزانہ ....." محمود نے کہنا چاہا، لیکن فرزانہ نے بات کاٹ دی۔

"بلکہ بات یہ تھی کہ تم سیر کرتے کرتے بہت دُور نکل گئے

تھے:" اس نے اب بھی جلے بھنے انداز میں کہا۔
"ہم نے سیر ضرور معمول سے کچھ زیادہ کی تھی، لیکن اس کی وجہ سے ہم صرف چند منٹ لیٹ آئے۔ ہمیں تو دراصل ایک اور ہی واقعہ پیش آگیا۔" محمود بولا۔
"بس رہنے دو— میں کوئی فرضی واقعہ سننے کے لیے تیار نہیں— کان کھول کر سُن لو، جوں ہی ابا جان گھر میں داخل ہوں گے، میں تمہاری شکایت داغ دوں گی— انہیں بتا دوں گی کہ تم کس وقت گھر میں آئے تھے اور اس دوران میں کس قدر پریشان رہی تھی۔" فرزانہ نے گھڑی کی طرف دیکھا۔
"ہاں ہاں، نوٹ کر لو ٹائم— یہ گیدڑ بھبکیاں کسی اور کو دینا۔ ہم تمہیں سو فیصدی سچّا واقعہ سنانے چلے تھے— خیر، اب تم یہ واقعہ صبح کے اخبارات میں پڑھ لینا۔ اب ہمارے لیے کھانا لاؤ۔" فاروق نے بھی تیز لہجے میں کہا۔
"کھانا لاتی ہے میری جوتی— باورچی خانے میں جا کر خود ہی گرم کرو اور کھا لو۔"
"فرزانہ، کم از کم میری بات کا تو یقین کر لو۔" محمود نے اسے منانے کے لیے کہا۔
"کیا مطلب؟ میں تمہارے مقابلے میں جھوٹا ہوں؟" فاروق نے اسے گھورا۔

"مم، میرا یہ مطلب نہیں تھا۔" محمود نے جلدی سے کہا۔
"تو پھر تمہارا کیا مطلب تھا؟" فاروق نے اس سے بھی تیزی دکھائی۔
"میں فرزانہ سے بات کر رہا تھا، تم سے نہیں۔" محمود جھلا اٹھا۔
"اب معلوم ہوتا ہے، جیسے تم دونوں مجھے واقعی کوئی سچا واقعہ سنانے والے ہو— چلو تمہاری خاطر میں یہ زحمت گوارا کر لیتی ہوں۔" فرزانہ نے ہار مانتے ہوئے کہا۔
"کون سی زحمت؟" فاروق نے منہ بنایا۔
"سو فیصد سچا واقعہ سننے کی۔"
"سُنو فرزانہ—" یہ کہہ کر محمود نے اسے پوری تفصیل سنا دی— فرزانہ گہری سوچ میں گم ہو گئی— کئی سیکنڈ تک سوچ میں گم رہنے کے بعد آخر اس نے کہا:
"اس حلیے سے تو مجھے گہری سازش کی بُو محسوس ہو رہی ہے۔ اُف خدا، اباجان اور امی جان بھی ضرور کسی پریشانی میں مبتلا ہونے والے ہیں۔"
"کیا مطلب؟" محمود اور فاروق ایک ساتھ چونکے۔
"ٹھہرو۔" اس نے کہا اور پھر دوڑ کر ٹیلی فون کے پاس گئی— اس کے چہرے پر نظر آنے والے گھبراہٹ کے آثار دیکھ کر محمود اور فاروق بھی بوکھلا اٹھے۔ اس نے جلدی جلدی کسی کے نمبر ڈائل

یکے اور پھر بولی :

"ہیلو انکل، میں فرزانہ بول رہی ہوں — ذرا ابا جان سے بات کرا دیں۔"

"لیکن بیٹی، وہ تو ایک گھنٹا پہلے یہاں سے روانہ ہو چکے ہیں۔" دوسری طرف سے کہا گیا۔

"اوہ۔" اس کے منہ سے نکلا، پھر اس نے ریسیور ٹپخا اور ان دونوں کو گھورنے لگی۔

"کچھ بتاؤ گی بھی یا یونہی گھورتی رہو گی — ویسے اس طرح گھورتے رہنے سے کوئی مسئلہ بھی حل نہیں ہوگا۔" فاروق نے برا سا منہ بنایا۔

"اب سے تین گھنٹے پہلے کسی نے فون کیا تھا۔ وہ شخص ابا جان سے بات کرنا چاہتا تھا۔ میں نے اسے بتایا کہ وہ اس وقت شہر میں نہیں ہیں — یہ سن کر اس نے گھبراہٹ کا اظہار کیا اور کہا کہ وہ صرف انہیں فون پر ایک پیغام دینا چاہتا ہے۔ پیغام بہت اہم ہے، وہ اپنی آواز میں ہی ان کے کانوں تک پہنچانا چاہتا ہے۔ یہ سن کر میں نے اسے نمبر بتا دیے۔ ساتھ میں شہر کا نام بھی بتا دیا۔"

"اوہ، لیکن اس سے تو یہ کسی طرح بھی نتیجہ نہیں نکلتا کہ وہ خطرے میں ہیں۔" محمود نے کہا۔

"تمہارا تو چل گیا ہے دماغ — اب الجھن یہ ہے کہ وہ وہاں سے روانہ ہو چکے ہیں۔ ہمیں ان کی مدد کے لیے ان تک پہنچنا ہی ہوگا — تم دونوں اگر میرا ساتھ نہیں دینا چاہتے تو میں تنہا جا رہی ہوں۔" فرزانہ جلدی جلدی بولی۔

"اب تمہارا دماغ چل گیا — ہم اتنے لمبے سفر اور پُرخطر مہم پر تمہیں جاتے ہوئے دیکھتے رہیں اور ٹس سے مس نہ ہوں، لعنت ہے ہم پر۔" یہ کہہ کر محمود اچھل کر کھڑا ہو گیا — فاروق نے بھی اُٹھنے میں دیر نہ لگائی۔ کھانے کا خیال تک ان کے ذہنوں سے نکل گیا تھا۔

"لیکن ہم جائیں گے کیسے؟" فاروق نے کہا۔

"کار میں، میں ڈرائیو کروں گا — اس وقت ڈرائیور کا بندوبست نہیں ہو سکتا، اس طرح دیر ہو جائے گی۔"

"ٹھیک ہے، آؤ۔" فرزانہ بولی۔

تینوں تیز تیز قدم اٹھاتے دروازے پر پہنچے — محمود نے دروازہ کھولا، پھر دھک سے رہ گیا۔

عجیب سی تبدیلی

"کہاں کی تیاری ہے دوستو"

ابھی وہ سنبھلے نہیں تھے کہ یہ جملہ کانوں سے ٹکرایا۔ دروازے میں چار ہٹے کٹے لمبے تڑنگے نوجوان کھڑے تھے۔ ان کے چہروں پر شیطانی مسکراہٹیں ناچ رہی تھیں — ہاتھوں میں سیاہ پستول چمک رہے تھے اور ان کی نالوں کا رخ ان کے سینوں کی طرف تھا۔

"آپ لوگوں کے کیا ارادے ہیں؟" آخر محمود خود پر قابو پانے میں کامیاب ہو گیا۔

"تمہارے لیے خطرناک، ہمارے لیے دل خوش کن" ان میں سے ایک نے شوخ لہجے میں کہا۔

"یہ تو دوغلے ارادے ہوئے — خیر، وضاحت کریں" فاروق نے منہ بنایا۔

"کیوں نہ اندر چل کر وضاحت ہو جائے" دوسرا پستول والا بولا

"چلو یونہی سہی" محمود نے کندھے اچکائے۔

"کیا آج کار کے ذریعے تم نے ہی ان دونوں کو کچلنے کی کوشش کی تھی" فرزانہ کچھ سوچ کر بولی۔

"اوہو، بہت تیز ہو تم — چلو ہم مانے لیتے ہیں، وہ — ہم — ہی — تھے" اس نے ایک ایک لفظ پر اٹک اٹک کر کہا۔

"یہ الفاظ تمہارے گلے میں کیوں اٹک رہے ہیں۔ گلے کی کوئی بیماری ہے کیا؟" فاروق نے حیران ہو کر کہا۔

"اس کی وضاحت بھی اندر چل کر ہو جائے گی"

"تو یوں کہو، اندر جانے کا تہیہ کر کے آئے ہو — آؤ بھئی، ان لوگوں کو اندر کی سیر کرا ہی دیں" فاروق نے مڑتے ہوئے کہا۔

"ہمارے آگے آگے چلو"

"جی بہت بہتر — کوئی اور حکم ہو تو وہ بھی بتا دیجیے گا" فرزانہ نے پاؤں پٹخ کر کہا۔

"ہم تمہارے بارے میں بہت کچھ جانتے ہیں، لہذا کوئی شرارت نہیں چلے گی" ایک بولا۔

"ہاں، بے چاری شرارت کی کل رات ٹانگیں ٹوٹ گئی تھیں" فاروق نے افسوس زدہ لہجے میں کہا۔

"اور اب تم لوگوں کی ٹانگیں ٹوٹنے کی باری ہے"

"اس تازہ خبر کے لیے شکریہ — چلو اچھا ہے، ہمارا یہ شوق بھی پورا ہو جائے گا" فاروق بولا۔

وہ صحن میں آئے اور میز کے پاس رک گئے۔ دل دھک
دھک کر رہے تھے، کیونکہ اس وقت ان کے پاس اپنے کھلونے
تو ضرور موجود تھے، لیکن وہ جیبوں میں تھے اور ان لوگوں کا دعویٰ
تھا کہ وہ ان کے بارے میں سب کچھ جانتے ہیں۔ جیبوں میں
کھلونے بھی اس لیے تھے کہ اس وقت اپنے خیال کے مطابق
وہ اپنے ابا جان اور امی جان کی جان بچانے کے لیے نکلے تھے،
ورنہ عام حالات میں کھلونے ہر وقت ان کے پاس نہیں ہوتے تھے۔
فرزانہ نے کچھ سوچ کر ایک قدم آگے بڑھایا اور بولی:

"اوہو، میں بالوں میں کلپ لگانا تو بھول ہی گئی۔" یہ کہہ کر
اس نے ہاتھ جیب کی طرف لے جانے کا ارادہ کیا ہی تھا کہ پستول
والا بولا:

"نہیں بھئی، اب رہنے دو۔ کلپ پھر لگا لینا۔ پہلے تو ہم سے
نبٹ لو۔"

"کیا مطلب، کیا میں بالوں میں کلپ بھی نہیں لگا سکتی؟" فرزانہ
نے غرا کر کہا۔

"بالکل نہیں لگا سکتیں۔۔۔ اس لیے کہ ہم تمہارے کھلونوں سے
بھی واقف ہیں۔ تم تینوں گھر کی تلاشی لو، میں ان کے پاس ٹھہروں گا۔"

"دیکھ لو استاد، کہیں یہ تمہیں کوئی ہاتھ نہ دکھا جائیں۔" ایک
نے کہا۔

"فکر نہ کرو ٹنگو، میں ان کی رگ رگ سے واقف ہوں۔ باس
نے یہ کام یونہی تو میرے ذمے نہیں لگا دیا۔ وہ اچھی طرح جانتا
ہے، اس کا کونسا آدمی کونسا کام اچھی طرح انجام دے سکتا ہے۔
میرے پاس ان لوگوں کی ایک پوری فائل موجود ہے۔ اس فائل
میں ان لوگوں کے بارے میں مکمل معلومات موجود ہیں۔ آج جب
باس نے مجھ سے پوچھا، استاد کالے، کیا تم بتا سکتے ہو کہ انسپکٹر جمشید
اور ان کے بال بچے اس وقت کہاں ہیں تو میں نے فوراً کہہ دیا
کہ پانچ منٹ تک بتا سکوں گا اور پانچ منٹ کے اندر میں نے
اسے بتا دیا کہ بچے تو گھر میں ہی ہیں؛ البتہ ماں باپ دوسرے
شہر ایک شادی میں شرکت کے لیے گئے ہیں اور پھر باس نے اپنا
پروگرام مجھے بتایا۔ ہاں تو میں کہہ رہا تھا، تم تینوں بہت ہوشیاری
سے اس گھر کی تلاشی لے لو۔۔۔ کام کی ایک چیز بھی گھر میں نہ
رہنے پائے۔ نقدی اور زیورات تمہارے ہوں گے۔ باس کو تو
بس کاغذات سے غرض ہے۔۔۔ کاغذات خواہ کسی قسم کے بھی ہوں،
دیکھنے کی ضرورت نہیں، بس سمیٹ لو۔"

"بہت اچھا استاد، ہم اپنا کام شروع کرتے ہیں۔ یاد رہے،
اس کام کو شروع کرتے وقت ہمیں پستول جیبوں میں رکھنا پڑیں گے۔"

"ہاں، میں جانتا ہوں۔ تم بے فکر ہو کر پستول جیبوں میں رکھ لو۔"

وہ تینوں انسپکٹر جمشید کے کمرے کی طرف بڑھ گئے۔

"اگر دائیں ہاتھ کا ہو تو بھی کیا فرق پڑ جائے گا" فاروق بولا۔

انہیں اسی حالت میں آدھ گھنٹے تک کھڑے رہنا پڑا تب کہیں جا کر اس کے تینوں ساتھی باہر آئے۔ اب وہ لدے پھندے نظر آ رہے تھے۔

"ہاں بھئی، کچھ چھوڑ تو نہیں آئے"

"نہیں استاد، سب کچھ سمیٹ لائے ہیں"

"ٹھیک ہے، یہ سب چیزیں ویگن میں رکھ کر میرے پاس آجاؤ" اس نے انہیں حکم دیا۔

"بہت اچھا استاد" وہ تینوں چلے گئے۔ دو منٹ بعد ان کی واپسی ہوئی۔

"سنو دوستو، تم لوگ خود کو بہت چالاک سمجھتے ہو۔ انسپکٹر جمشید کا خیال بھی یہی ہے کہ دنیا میں ان سے بہتر کوئی سراغرساں نہیں، لیکن تمہیں بتاتا چلوں کہ یہاں ایک سے بڑھ کر ایک موجود ہے۔ اس پستول کو تم تقریباً نصف گھنٹے سے دیکھ رہے ہو، لیکن ایک بار بھی تم نے محسوس نہیں کیا کہ یہ اصلی پستول نہیں ہے"

"کیا کہا؟" وہ حیرت زدہ رہ گئے۔

"ہاں، یہ اصلی پستول نہیں ہے، میرا مطلب ہے، اس کی نالی میں سے کوئی گولی نہیں نکلتی"

"تم سامنے والی دیوار سے لگ کر کھڑے ہو جاؤ۔ میں اپنے اور تمہارے درمیان کافی فاصلہ رکھنے کا خواہش مند ہوں"

"اچھا" فاروق جھلائے ہوئے انداز میں بولا اور تینوں دیوار کے پاس کھڑے ہو گئے۔

"اپنے ہاتھ سر سے بلند کر لو" اس نے ایک اور حکم دیا۔ انہوں نے منہ سے کوئی لفظ نکالے بغیر ہاتھ اوپر اٹھا دیے۔

"اب اگر تم میں سے کسی کے ہاتھ نیچے گرتے نظر آئے، میں فائر کر دوں گا"

"لیکن جناب، ہم اس طرح کب تک کھڑے رہ سکتے ہیں" محمود نے برا سا منہ بنایا۔

"جب تک میرے ساتھی اپنا کام مکمل نہیں کر لیتے"

"لیکن اگر آپ کے ساتھی اس کام میں دو تین گھنٹے لگا دیں تو کیا ہم تمام وقت ہاتھ اٹھائے کھڑے رہیں گے" فاروق بولا۔

"ہاں بالکل، ویسے اتنی دیر ہرگز نہیں لگے گی — میرے ساتھیوں کے پاس تالے کھولنے کے لیے بہت بہترین قسم کی چابیاں موجود ہیں۔ یہاں تک کہ نمبروں والے تالے کھولنا بھی ان لوگوں کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے"

ان الفاظ کا سُننا تھا کہ محمود، فاروق اور فرزانہ بے تحاشا اس کی طرف لپکے، لیکن عین اسی وقت استاد نے ٹریگر دبا دیا اور دباتا چلا گیا۔ پستول کی نالی میں سے کوئی گولی واقعی نہیں نکلی، لیکن اس میں سے کسی مائع کی پتلی سی دھار تین مرتبہ ضرور نکلی اور ان کے چہروں پر پڑی — ایک سیکنڈ کے لیے انہیں محسوس ہوا کہ ان کے چہرے برف بن گئے ہیں اور پھر وہ بے ہوش ہو کر گر پڑے۔

"چلو بھئی، اٹھاؤ اب ان سورماؤں کو اور ڈال دو ویگن میں۔ باس نہ جانے کیوں انہیں اپنی آنکھوں کے سامنے مرتے دیکھنا چاہتا ہے، ورنہ ہم تو ان کا کانٹا یہیں نکال جاتے۔"

استاد کی آواز انسپکٹر جمشید کے گھر میں گونج کر رہ گئی، لیکن اس کے ساتھیوں کے سوا اس آواز کو سننے والا اور کوئی نہیں تھا۔ ہاں، فرزانہ کی بلی سونی ضرور تھی جو ایک الماری کے پیچھے دبکی یہ سب کچھ دیکھ رہی تھی —

○

"شاید یہ وہی کار ہے۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"تب تو ان لوگوں سے جھڑپ بھی ہو سکتی ہے۔" عرفان فوری

نے فکرمند ہو کر کہا۔

"کیا آپ کو خوف محسوس ہو رہا ہے؟"

"جی ہاں، اس قسم کے حالات کا میں کبھی شکار نہیں ہوا۔ ایک پُرامن شہری ہوں، اپنے کام سے کام رکھتا ہوں — نہ میری کسی سے دشمنی، نہ میں کسی کا دشمن۔" انہوں نے جلدی جلدی کہا۔

"آپ فکر نہ کریں، ہم ان سے جھگڑا نہیں کریں گے، صرف تعاقب کریں گے اور اگر کوئی خطرہ پیش بھی آیا تو آپ اس کی لپیٹ میں ہرگز نہیں آئیں گے۔"

"بہت بہت شکریہ۔" اس نے اب بھی گھبرائی ہوئی آواز میں کہا۔

تعاقب جاری رہا، پھر اچانک اگلی کار کی رفتار کم ہو گئی اور وہ سڑک کے کنارے ہو گئی، جیسے اگلی کار والے پچھلی کار کو راستا دینا چاہتے ہوں — انسپکٹر جمشید کار اس کے برابر لے آئے اور یہ دیکھ کر ان کی حیرت بڑھی کہ اسے ایک عورت چلا رہی تھی۔ وہ مردانہ لباس میں تھی — انسپکٹر جمشید چونک اُٹھے — اسی وقت عورت بولی:

"آپ بہت دیر سے میرا تعاقب کر رہے ہیں، آخر کیوں؟"

"آپ کار روک لیں اور میرے سوالات کے جواب دیں۔"

"کیوں' آپ کون ہیں مجھے روکنے والے' میں کیوں رکوں؟"

"مجھے انسپکٹر جمشید کہتے ہیں۔ قانون مجھے اس بات کی اجازت دیتا ہے کہ میں آپ کی اور آپ کی کار کی تلاشی لے سکوں۔"

"انسپکٹر جمشید' یہ نام میں نے سُن رکھا ہے۔ سوال یہ ہے کہ آپ میری تلاشی کیوں لینا چاہتے ہیں؟"

"اس کی بہت بڑی وجہ ہے۔ تقریباً ایک سو کلومیٹر دُور میری جیپ پر بم پھینکا گیا اور پھر بم پھینکنے والے ایک کار میں بیٹھ کر اس سمت میں فرار ہو گئے۔ میں نے ان صاحب کی کار میں لفٹ لی اور نکل کھڑا ہوا۔ اس وقت سے اب تک یہ پہلی کار ہے' جسے میں پکڑ سکا ہوں۔"

"تو کیا آپ اس سڑک پر چلنے والی ہر کار کی تلاشی لیں گے؟"

"ہاں' بالکل۔"

"آئیے' شوق سے تلاشی لیجیے۔" اس نے کہا۔

"بیگم' تم ان کی تلاشی لو' میں کار کی لیتا ہوں۔ فوزی صاحب آپ بیٹھے رہیے۔"

"جی بہتر۔" انھوں نے کہا۔

عورت کی تلاشی لینے پر کچھ نہ ملا۔ کار کی تلاشی سے بھی کوئی ایسی چیز نہیں ملی' جس سے یہ معلوم ہوتا کہ بم پھینکنے والوں

کا تعلق اس کار سے ہے۔ کار کی پچھلی سیٹ پر ایک دُوربین ضرور موجود تھی' لیکن اس معاملے سے دُوربین کا بھلا کیا تعلق' چنانچہ انھوں نے تلاشی کا کام ختم کرتے ہوئے کہا:

"آپ کا نام؟"

"زہرا بخاری۔ میرے شوہر کا انتقال ہو چکا ہے۔ ڈاکٹر مجید بخاری نام تھا اُن کا۔"

"یہ دُوربین کس لیے ساتھ لیے پھر رہی ہیں؟" انھوں نے پوچھا۔

"شوق سے' دوربین کے ذریعے دُور کی چیزوں کا نظارا ہو جاتا ہے۔" اس نے جواب دیا۔

"کار کے نمبر اور اپنا پتا بھی لکھوا دیں۔"

"۲۴۵ جون گڑھ۔ کار کا نمبر ۳۹۴۹ ایم بی۔"

"بہت بہت شکریہ۔ امید ہے' معاف فرمائیں گی۔"

"کوئی بات نہیں۔" اس نے کہا۔

وہ کار میں بیٹھے اور آگے بڑھے۔ زہرا بخاری کی کار پیچھے رہ گئی۔

"کیا اندازہ لگایا آپ نے؟" بیگم جمشید نے پوچھا۔

"کچھ کہہ نہیں سکتا' شک کرنے کی کوئی وجہ نہیں۔" انھوں نے کہا۔

"تب وہ لوگ آگے نکل گئے ہیں اور ابھی کافی سفر باقی ہے۔

شاید ملاقات ہو جاتے" بیگم جمشید بولیں۔

"ہاں، کیوں نہیں — امید پر دنیا قائم ہے"

ان کا سفر جاری رہا — اچانک انسپکٹر جمشید کو ایک خیال آیا۔ انھوں نے کار ایک طرف کر کے یک دم روک لی۔ چند سیکنڈ بھی نہیں گزرے تھے کہ زہرا بخاری کی کار پاس سے گزری۔ ساتھ ہی انھوں نے کار چلادی۔ دونوں کاریں ساتھ ساتھ چلنے لگیں۔

"کیا بات ہے جناب، کیا آپ کچھ اور پوچھنا چاہتے ہیں؟"

زہرا بخاری کے لہجے سے پریشانی جھلک رہی تھی۔

"جی ہاں، معاف کیجیے گا — میں یہ — میں یہ —" انسپکٹر جمشید اٹک کر رہ گئے — ان کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

"آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟" زہرا بخاری نے حیران ہو کر کہا۔

"آپ اتنی رات گئے اس سنسان سڑک پر تنہا سفر کر رہی ہیں، کیا یہ بات عجیب نہیں — میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ آپ کہاں سے تشریف لا رہی ہیں؟"

"میں ماڈل سٹی گئی تھی، اپنے چند عزیزوں سے ملنے۔ کیا آپ کو اس پر بھی اعتراض ہے؟"

"اعتراض — جی نہیں، بھلا مجھے کیوں اعتراض ہونے لگا۔ مہربانی فرما کر ان عزیزوں کا پتا بھی لکھوا دیں" وہ بولے۔

"گویا آپ اس بات کی بھی تصدیق کریں گے؟" زہرا بخاری نے

حیران ہو کر پوچھا۔

"جی ہاں، میرا پیشہ ہی ایسا ہے۔ اس میں کوئی پہلو بھی نظر انداز نہیں کیا جاتا"

"کوئی بات نہیں، پتا لکھ لیجیے، اجمل شریف ۱۱۱ خان روڈ ماڈل سٹی —"

"فون نمبر؟"

"فون — ہاں، ان کے فون نہیں ہے" اس نے کہا۔

"بہت بہت شکریہ — دوبارہ زحمت دینے کے لیے معافی چاہتا ہوں —"

وہ پھر آگے بڑھ گئے اور کار کی رفتار بڑھاتے چلے گئے۔ جلد ہی زہرا بخاری کی کار بہت پیچھے رہ گئی۔ یہاں تک کہ نظروں سے اوجھل ہو گئی —

"آپ جملہ کہتے کہتے اٹک کیوں گئے تھے؟" بیگم جمشید نے حیرت زدہ لہجے میں کہا۔

"مجھے اس کی کار میں ایک عجیب سی تبدیلی نظر آئی تھی — اس تبدیلی نے مجھے اٹکنے پر مجبور کر دیا —"

"اور وہ تبدیلی کیا تھی؟"

"دوربین پہلے پچھلی سیٹ پر رکھی تھی اور اب وہ کار کی اگلی سیٹ پر نظر آئی — آخر رات کو اس دوربین کی کیا ضرورت

پلیٹ آگئی:

"حیرت ہے! بہت تیز مشاہدہ ہے آپ کا۔ ہم نے تو یہ بات نوٹ ہی نہیں کی۔" عرفان فوزی کے منہ سے نکلا۔

"جی بس، اسی کو سراغرسانی کہتے ہیں۔"

"تو کیا آپ کو اب زہرا بخاری پر شک ہے؟"

"دوربین کی وجہ سے معمولی سا شک تو ہو گیا ہے۔ اب میں جلد از جلد کسی فون بوتھ تک پہنچ جانا چاہتا ہوں۔"

"کیوں، کسے فون کرنے کا ارادہ ہے؟"

"میں یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ اجمل شریف کے گھر میں فون ہے یا نہیں۔ اب اگر اس کے گھر میں فون ہوا تو مزا آجائے گا، کیونکہ اس طرح وہ جھوٹی ثابت ہو جائے گی۔ جب کہ مجھ سے جھوٹ بولنے کی اسے کوئی ضرورت نہیں تھی۔" انہوں نے پرجوش لہجے میں کہا۔

"تو کیا آپ کو یقین ہے کہ وہ جھوٹ بول رہی تھی؟" بیگم جمشید بولیں۔

"ہاں، مجھے یقین ہے۔" وہ بولے۔

بیگم جمشید اور عرفان فوزی حیران رہ گئے، کیونکہ ان کے خیال میں تو زہرا بخاری کا اس معاملے سے قطعاً کوئی تعلق نہیں تھا اور پھر جونہی ایک پبلک فون بوتھ نظر آیا، انہوں نے کار روک لی

جلدی سے نیچے اترے اور ڈائریکٹری میں اجمل شریف کے نام کی تلاش شروع کر دی۔ ماڈل سٹی میں کئی اجمل شریف تھے، لیکن وہ پتا کسی اجمل شریف کے نام کے آگے نظر نہ آیا جو زہرا بخاری نے بتایا تھا، لہذا وہ تصدیق نہ کر سکے اور اس کا ایک مطلب یہ بھی تھا کہ زہرا بخاری جھوٹی نہیں تھی، لیکن ابھی کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ انہوں نے ماڈل سٹی کے ایک پولیس انسپکٹر کو فون کیا اور بولے:

"ہیلو تنویر خان، میں انسپکٹر جمشید بول رہا ہوں۔ مہربانی فرما کر فوری طور پر ایک آدمی کا پتا چلایا جائے۔ اس کا نام اجمل شریف ہے۔ پتا ۱۱ خان روڈ ماڈل سٹی ہے۔ میرا گھر کا فون نوٹ کر لیں۔ میں اسی نمبر پر انتظار کروں گا۔"

"ٹھیک ہے، میں آدھ گھنٹے تک فون کروں گا۔" دوسری طرف سے کہا گیا۔

یہاں سے انہوں نے ایک ٹیکسی پکڑی۔ عرفان فوزی کا شکریہ ادا کیا اور گھر پہنچے۔ دوسرا لمحہ خوف ناک تھا۔ گھر کا دروازہ چوپٹ کھلا تھا۔ اور اندر مکمل طور پر تاریکی تھی۔

"یا اللہ رحم۔" بیگم جمشید کے منہ سے نکلا۔

"حوصلہ رکھو بیگم، ہم اس قسم کے حالات کا آئے دن شکار ہوتے رہتے ہیں۔ یہ ہمارے لیے کوئی نئی بات نہیں۔" انہوں نے کہا اور

اندر داخل ہوگئے۔

لائٹیں جلائی گئیں اور ان پر یہ حقیقت واضح ہوگئی کہ محمود، فاروق اور فرزانہ اندر نہیں ہیں — صحن میں کرسیاں قدرے بے ترتیب سی تھیں۔ پورے گھر کی تلاشی لی گئی تھی۔ تجوری اور الماریاں بالکل خالی پڑی تھیں؛ گویا مکمل طور پر صفایا کر دیا گیا تھا، لیکن سوال تو یہ تھا کہ اگر یہ چوروں کا کام ہے تو محمود، فاروق اور فرزانہ کیوں غائب ہیں —

"ہو سکتا ہے، وہ چوروں کے تعاقب میں گئے ہوں۔" انسپکٹر جمشید نے بیگم کی ڈھارس بندھائی۔

"خدا کرے، یہی بات ہو۔"

عین اسی وقت فون کی گھنٹی بجی — انھوں نے ریسیور اٹھایا تو دوسری طرف سے ماڈل سٹی کا انسپکٹر بات کر رہا تھا۔

پانچ سیکنڈ میں

"ہیلو سر، تنویر خان بول رہا ہوں۔ ۱۱۱ خان روڈ پر اجمل شریف نام کا کوئی آدمی نہیں رہتا۔ پوری طرح اطمینان کر لیا گیا ہے۔"

"خان روڈ نمبر ۱۱۱ پر کون رہتا ہے؟" انھوں نے پوچھا۔

"کوئی بھی نہیں۔ اس سڑک پر ۱۱۱ نمبر کا مکان گزشتہ سیلاب میں گر گیا تھا۔ اس کے بعد سے اب تک اسے بنوایا ہی نہیں گیا؛ تاہم یہ بات معلوم کر لی گئی ہے کہ اس کے مالک کا نام اجمل شریف نہیں ہے، کوئی سرور سلطان ہے۔"

"بہت بہت شکریہ۔" یہ کہہ کر انھوں نے ریسیور رکھ دیا اور سوچ میں ڈوب گئے۔

"خیر تو ہے، کیا کوئی اور بری خبر سنی ہے۔" بیگم جمشید پریشان ہوگئیں —

"نہیں بیگم، میرا شک درست نکلا — وہ عورت زہرا بخاری بالکل جھوٹی نکلی، جس کا مطلب یہ ہے کہ بم پھینکنے والوں میں سے ایک وہ

بھی تھی، کیونکہ اس نے اپنے جس عزیز کا نام اور پتا لکھوایا تھا، وہاں اس نام کا کوئی آدمی نہیں رہتا۔"

"اوہ، تب تو آپ اسے گرفتار کر سکتے ہیں۔ اس نے اپنا پتا بھی تو لکھوایا تھا۔"

"ہاں، میں اس پتے پر بھی چھان بین کروں گا، لیکن اس وقت تو میں محمود، فاروق اور فرزانہ کے لیے بے چین ہوں — کاش وہ لوٹ آئیں اور پھر میں زہرا بخاری کی تلاش میں نکلوں، رات کے وقت اس عورت کے گھر جانا بھی ٹھیک نہیں لگتا۔"

بقیہ رات ان کی پریشانی میں گزری۔ آخر ناشتے کے بعد انہوں نے اکرام کو فون کیا۔

"ہیلو اکرام، تازہ ترین حالات سنو۔ محمود، فاروق اور فرزانہ گھر سے غائب ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے، جیسے انہیں اغوا کیا گیا ہے۔ رات میں اور بیگم ماڈل سٹی سے لوٹ رہے تھے، گھر پہنچے تو انہیں غائب پایا۔ ادھر ہم پر بھی ایک بم پھینکا گیا — اس کی تفصیلات بھی سن لو۔" یہ کہہ کر وہ بتانے لگے، آخر بولے:

"اب تمہارے ذمے یہ کام ہے کہ اس سڑک پر پہنچ جاؤ اور جیپ اور بم کے ٹکڑے جمع کر ڈالو۔ ایک ٹکڑا میں بھی اٹھا لایا تھا، وہ مجھ سے لے لینا — میرا خیال ہے، بم ہمارے دشمن ملک کا تیار کردہ ہے اور اس طرح اس حادثے کی اہمیت بہت بڑھ جاتی

ہے، گویا دشمن ملک کے کچھ ایجنٹوں کو خاص طور پر یہ ہدایات دی گئی ہیں کہ مجھے اور میرے بچوں کو بم سے اڑا دیا جائے یا جیسے بھی ہو، ختم کر دیا جائے — ہمیں ختم کرنے کے پروگرام پر عمل شروع ہو چکا ہے اور محمود، فاروق اور فرزانہ غائب ہیں۔"

"بہت ہی خطرناک حالات ہیں۔ اب آپ کیا ارادہ رکھتے ہیں؟"

"میرے پاس لے دے کے ایک ہی راستا باقی ہے اور وہ یہ کہ میں زہرا بخاری کو گرفتار کر لوں، لہذا میں اب اس کی طرف روانہ ہو رہا ہوں۔"

"بہت بہتر، میں بھی اپنی مہم پر روانہ ہوتا ہوں — خدا کرے، محمود، فاروق اور فرزانہ مل جائیں۔"

انہوں نے ریسیور رکھ دیا اور بیگم سے بولے:

"تم دروازہ اندر سے بند کر کے بیٹھ جاؤ۔ میں گھر سے نکلتا ہوں۔"

"خدا حافظ۔" وہ بولیں۔

اور وہ خدا حافظ کہتے ہوئے باہر نکلے — کار میں بیٹھ کر جون گڑھ پہنچے۔ ۲۴۵ نمبر کی کوٹھی تلاش کرنے میں انہیں کوئی دقت نہیں ہوئی۔ انہیں قدرے حیرت ہوئی، ورنہ وہ تو یہی سمجھے تھے کہ اجمل شریف کی طرح ۲۴۵ نمبر کی کوٹھی بھی جون گڑھ میں نہیں ملے گی — دھک دھک کرتے دل کے ساتھ انہوں نے

دروازے پر دستک دی۔ جلد ہی دروازہ کھلا اور ایک بوڑھے ملازم
کی صورت دکھائی دی۔

"جی فرمائیے؟"

"مجھے زہرا بخاری صاحبہ سے ملنا ہے۔"

"جی، کس سے؟" اس نے حیران ہو کر کہا۔

"زہرا بخاری سے جو ڈاکٹر مجید بخاری مرحوم کی بیوہ ہیں۔"

"آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ یہاں اس نام کی کوئی عورت
نہیں رہتی۔" ملازم نے کہا اور واپس مڑنے لگا۔

"ایک منٹ بڑے میاں، یہ تو بتا دیں یہاں کون رہتا ہے؟"

"موسیٰ علیم صاحب کی کوٹھی ہے یہ۔۔ وہ سرکاری محکمے میں ملازم
ہیں، اور کچھ؟" ملازم نے بُرا مان کر کہا۔

"اور ان کی کار کا نمبر کیا ہے؟"

"۲۶۱۴-آر، آخر آپ چاہتے کیا ہیں؟"

"کیا موسیٰ علیم صاحب اس وقت گھر ہیں؟"

"جی ہاں، ناشتا کر رہے ہیں۔ ناشتے سے فارغ ہوتے ہی
دفتر چلے جائیں گے۔" اس نے کہا۔

"بہت خوب، میرا کارڈ انہیں دے دیں۔ میں ان سے ملنا
چاہتا ہوں۔"

"لیکن ابھی تو آپ کہہ رہے تھے کہ کسی زہرا بخاری سے ملنا

چاہتے ہیں۔"

"ہاں، کسی زہرا بخاری نے مجھے یہی پتا بتایا تھا۔ اس کا
مطلب ہے، اس نے جھوٹ بولا تھا۔ میں جاننا یہ چاہتا ہوں،
اسے موسیٰ علیم صاحب کے گھر کا پتا کیسے معلوم تھا؟"

"جو نمبر اور نام اس کے منہ میں آیا ہوگا، اس نے
بول دیا ہوگا۔۔ اس میں حیرت کی کیا بات ہے؟" بوڑھے نے کہا۔

"ہاں، آپ ٹھیک کہتے ہیں، لیکن ان سب باتوں کے
باوجود میں موسیٰ صاحب سے ملنا پسند کروں گا۔۔ آپ میرا کارڈ
ان تک پہنچا دیں۔"

یہ کہہ کر انہوں نے کارڈ جیب سے نکال کر بوڑھے کو دے
دیا۔ وہ بُرے بُرے منہ بناتا چلا گیا، لیکن پھر بوکھلایا ہوا واپس
آیا۔۔

"اندر۔۔ اندر تشریف لائیے جناب۔۔ صاحب آپ کا انتظار
کر رہے ہیں۔"

"شکریہ۔" انہوں نے کہا اور اس کے ساتھ ڈرائنگ روم
میں داخل ہوئے۔۔ ایک خوش شکل ادھیڑ عمر کے آدمی نے اٹھ
کر ان کا استقبال کیا اور گرمجوشی سے مصافحہ کیا۔

"میں اسے اپنی خوش قسمتی سمجھتا ہوں کہ آپ میرے گھر
میں تشریف لائے۔ رمضو نے آپ کو پریشان تو کیا ہوگا۔"

"جی بمعنو، کون؟" انہوں نے جلدی سے پوچھا۔

"میرا ملازم — اس کی عادت ہے، ملاقاتیوں سے ذرا سخت انداز سے پیش آتا ہے۔"

"خاص سختی سے تو پیش نہیں آئے۔" انہوں نے مسکرا کر ملازم کی طرف دیکھا اور وہ گڑبڑا گیا۔

"مم، میں — میں معافی چاہتا ہوں جناب۔"

"کوئی بات نہیں۔" یہ کہہ کر وہ موسیٰ علیم کی طرف مڑے اور پھر انہیں ساری بات سنا ڈالی۔ آخر بولے:

"میں جاننا صرف یہ چاہتا ہوں کہ آپ کسی زہرا بخاری نامی عورت یا ڈاکٹر مجید بخاری آدمی سے واقف ہیں، جن کی کار کا نمبر ۳۹۴۹ - ایم بی ہو؟"

"جی نہیں، بالکل نہیں — میں حیران ہوں کہ اس عورت نے میری کوٹھی کا نمبر آپ کو کس طرح بتا دیا۔ شاید اس کے منہ میں یہی نمبر آتے ہوں گے۔"

"ضرور یہی بات ہے۔ اچھا جناب، بہت بہت شکریہ۔" یہ کہہ کر وہ اٹھ کھڑے ہوئے — موسیٰ علیم انہیں چائے وغیرہ کے لیے کہتے ہی رہ گئے۔

اب ان کی مایوسی بڑھ گئی۔ محمود، فاروق اور فرزانہ کا کوئی پتا نہیں تھا اور نہ ان پر حملہ کرنے والوں کا سراغ مل سکا تھا۔ صرف

ایک بات یقینی تھی کہ جن لوگوں نے ان پر حملہ کیا تھا۔ وہی لوگ محمود، فاروق اور فرزانہ کو اغوا کرنے کے ذمے دار تھے۔ گھر واپس پہنچنے کے کافی دیر بعد اکرام کی صورت دکھائی دی، وہ کافی تھکا ماندہ نظر آ رہا تھا۔

"سو کلومیٹر کے ادھر اور ادھر کئی کئی میٹر دور دور تک دیکھ ڈالا گیا جناب، کہیں کوئی ٹکڑا نہیں ملا — نہ جیپ کا نہ بم کا۔ حادثے کی جگہ سڑک پر گہرا گڑھا ضرور موجود ہے۔"

"اوہ، خیر ہمارے پاس بم کا ایک ٹکڑا تو موجود ہے ہی اور اس سے ثابت ہے کہ یہ کام ضرور کسی دشمن ملک کے ایجنٹ کا ہے۔ تم یہ لے جاؤ اور ماہرین کے حوالے کر دو۔ محمود، فاروق اور فرزانہ کی تلاش اب پورے شہر میں شروع ہو جانی چاہیے — میں ان کی طرف سے بہت فکر مند ہوں — ان کے ساتھ ساتھ گھر کے تمام کاغذات، نقدی اور زیورات غائب ہیں، ان کی گمشدگی کی بھی رپورٹ درج کرا دو۔"

"جی بہت بہتر —"

"اور ہاں، ایک عورت کا حلیہ نوٹ کر لو۔ سادہ لباس والوں کو اس حلیے کی جو عورت بھی نظر آئے، اس کی نگرانی شروع کر دی جائے اور فوری طور پر مجھے اطلاع دی جائے۔ خاص بات یہ کہ وہ اپنے ساتھ ایک دوربین بھی رکھتی ہے۔ اس کے پاس جو کار ہے —

ارے ہاں، اس کی کار کا نمبر بھی تو ہے ہمارے پاس — ٹھیک ہے،
سب سے پہلے یہ معلوم کرو کہ اس نمبر کی کار کس کی ہے۔ نمبر نوٹ
کرلو، ۳۹۴۹۔۰ ایم بی — اگر یہ نمبر کسی زہرا بخاری یا مجید بخاری کے
ثابت ہوں تو فوراً مجھے اطلاع دی جائے۔ کسی اور کے ہوں، تب
بھی میں اس کا نام پتا جاننا چاہوں گا۔"

"جی بہت بہتر، آپ فکر نہ کریں۔ بہت تیزی سے کام کیا
جائے گا۔" اکرام نے کہا اور چلا گیا۔

پندرہ منٹ بعد ان کے فون کی گھنٹی بجی اور انہوں نے بے
تابانہ انداز میں ریسیور اٹھا لیا۔

⊙

محمود کی آنکھ کھلی تو اس نے خود کو ایک کمرے کے فرش پر
پڑا پایا۔ فاروق اور فرزانہ اس کے دائیں بائیں پڑے تھے — وہ
ہڑبڑا کر اٹھا اور انہیں جھنجوڑ ڈالا۔

"ہم — میں کہاں ہوں؟" فاروق نے بوکھلا کر کہا۔

"ایک کمرے میں، لیکن مہربانی فرما کر یہ نہ پوچھنا کہ کمرہ کہاں
ہے۔"

"اچھا، نہیں پوچھتا — میں سمجھ گیا۔ تمہیں خود بھی معلوم نہیں

کہ کمرہ کہاں ہے۔"

"ہاں، تم ٹھیک کہتے ہو۔" اس نے فوراً کہا۔

"محمود، تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ ہمارے ہوش میں آنے سے پہلے
یہ تو معلوم کرنے کی کوشش کر لیتے کہ ہم کہاں ہیں اور کیوں ہیں۔"
فرزانہ نے جلے بھنے لہجے میں کہا۔

"اگر یہ بات ہے تو میں اور فاروق پھر سے بے ہوش ہو
جاتے ہیں — ذرا یہ کام تم ہی کر کے دکھا دو۔" محمود نے بھی جھلا
کر کہا۔

"واہ کتنی اچھی ترکیب ہے — میں تو اسی وقت دوبارہ بیہوش
ہونے کے لیے تیار ہوں۔"

"میری تو معلوم کرتی ہے جوتی۔" فرزانہ نے جل کر کہا۔

"دھت تیرے کی — معلوم ہوگیا، حالات کچھ بھی ہوں، تم دونوں باز
نہیں آ سکتے۔"

"ہم دونوں نہیں، ہم تینوں۔" فاروق بولا۔

اسی وقت کمرے کا دروازہ کھلا اور ان میں سے ایک کی صورت
دکھائی دی، جو ان کے گھر میں داخل ہو گئے تھے۔

"ہیلو استاد، یہ تم ہی ہو نا۔" فاروق چہک کر بولا۔

"ہاں، چلو تمہیں باس نے بلایا ہے۔"

"اب ہماری کیا ضرورت آ پڑی؟"

"پتا نہیں، اس بات پر تو ہم بھی حیران ہیں" وہ ابھی کچھ اور بھی کہنا چاہتا تھا کہ فاروق بول پڑا:

"خدا کا شکر ہے کہ تم بھی حیران ہونا جانتے ہو"

"چلو اٹھو، کہیں اس کا پارہ نہ چڑھ جائے"

"ارے، تو وہ کوئی تھرمامیٹر ہے ۔۔ ہائیں، تم ایک تھرمامیٹر کو اپنا باس سمجھتے ہو، لاحول ولا قوۃ، یہ تو بالکل ایسی ہی بات ہے، جس طرح پچھلی قومیں بتوں کو خدا مانتی تھیں" فاروق نے بلند آواز میں کہا۔

"عجیب ہو تم لوگ ۔۔ کیا پھر بے ہوش ہونے کا ارادہ ہے۔ اگر یہ بات ہے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ۔۔ میں تو جا کر باس سے کہہ دوں گا کہ تم لوگ ابھی ہوش میں نہیں آئے" یہ کہہ کر اس نے جیب سے پستول نکال لیا۔ یہ وہی پستول تھا، جس میں سے گولی کے بجائے باریک دھار نکلتی تھی اور انہوں نے اپنے دماغ برف کی طرح ٹھنڈے ہوتے محسوس کیے تھے۔ اس کے فوراً بعد وہ بے ہوش ہو گئے تھے۔

"ارے ارے، یہ کیا کر رہے ہیں آپ ۔۔ بے ہوش ہوں ہمارے دشمن ۔۔ چلیے ہم آپ کے ساتھ چلنے کے لیے تیار ہیں اور تیار بھی کوئی ایسے ویسے، گولی کی طرح جائیں گے"

وہ ہنس پڑا، تاہم پستول ہاتھ میں ہی رکھا اور وہ اس کے

آگے چلنے لگے۔ یہ کوئی بہت بڑی عمارت تھی ۔۔ آخر ایک کمرے میں داخل ہوئے۔ کمرہ ڈرائنگ روم کی طرز پر سجا ہوا تھا۔ لمبے چوڑے قد و قامت کا ایک آدمی صوفے میں دھنسا ہوا تھا۔ اس کی ننھی ننھی آنکھیں ہیرے کی کنیوں کی طرح چمک رہی تھیں۔

"تو یہ ہیں انسپکٹر جمشید کے بچے ۔۔ اوہ، بڑی دھوم سنی تھی ان کی۔ ڈرم تیار ہیں؟"

"جی ہاں، بالکل تیار ہیں" استاد نے کہا۔

"ٹھیک ہے، میں اپنی آنکھوں کے سامنے سب کچھ کراؤں گا"

"بہت بہتر، تشریف لے چلیے" استاد نے کہا۔

"آپ لوگ کیا ارادہ رکھتے ہیں، کچھ ہمیں بھی تو پتا چلے" محمود نے پہلی مرتبہ فکرمند ہو کر کہا۔ ڈرموں کے ذکر نے اسے ہلا ڈالا تھا۔

"بات صرف اتنی سی ہے کہ ہم تمہیں اس دنیا سے دوسری دنیا میں بھیج دینا چاہتے ہیں، تاکہ اب تم دوسری دنیا کی سیر کر کے دل بہلاؤ"

"اس کے لیے آپ کو تکلیف کرنے کی کیا ضرورت ۔۔ وہ اوپر والا ایک دن خود ہی دوسری دنیا میں پہنچا دے گا" فاروق نے اوپر دیکھا اور پھر اس کی نظریں گویا چھت میں گڑ گئیں ۔۔ نہایت قیمتی فانوس اس کے سر کے عین اوپر جگ مگ جگ مگ کر

رہا تھا۔ اس نے اتنا شاندار فانوس پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

"خیر تو ہے، تم اوپر ہی دیکھتے رہو گے کیا۔" محمود نے منہ بنایا۔

"میں خدا کی قدرت دیکھنے میں مصروف ہو گیا تھا۔" اس نے جلد ہی سر نیچے کر لیا، اگر محمود ٹوک نہ دیتا تو اس کی فانوس میں دل چسپی باس سے بھی چھپی نہ رہتی۔

"خدا کی قدرت دیکھنے کا تو اب تمہیں بہت وقت ملنے والا ہے، فکر نہ کرو۔" باس بولا۔

"جی اچھا۔" فاروق نے سعادت مندانہ لہجے میں کہا۔

اور اسی وقت باس اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ سب سے آگے انہیں چلنے کا اشارا کیا گیا۔ استاد کے ہاتھ میں بدستور پستول موجود تھا۔ ان کے دل اب بری طرح دھڑک رہے تھے؛ گویا وہ موت کے سفر پر روانہ کیے جانے والے تھے۔

"آپ نے ہمارا قصور نہیں بتایا۔"

"کوئی ایک قصور ہو تو بتاؤں بھی۔ تم لوگ تو سر سے پیر تک قصوروں سے ڈھکے ہوئے ہو۔"

"بھئی واہ، اتنے باقصور لوگ شاید پھر دیکھنے کو نہ ملیں۔ افسوس۔" فاروق نے پہلے خوش ہو کر کہا، پھر سرد آہ بھری۔

اسی وقت وہ ایک ہال میں داخل ہوئے۔ یہاں لوہے کے

تین بڑے ڈرم موجود تھے۔ ڈرموں کے پاس رسیاں بھی پڑی تھیں۔ ریت کی چھوٹی چھوٹی بے شمار تھیلیاں بھی موجود تھیں۔ محمود، فاروق اور فرزانہ آناً فاناً ان کا پروگرام سمجھ گئے اور ان کے رنگ سفید پڑ گئے۔ اسی وقت باس کی آواز سنائی دی:

"کہو دوستو، ڈرم پسند آئے۔ ہمیں کرنا بس اتنا ہے کہ تمہارے ہاتھ پیر باندھ کر ان ڈرموں میں ڈال دیں گے اور ریت کی یہ تھیلیاں ان میں بھر دیں گے۔ اس کے بعد ڈرم بند کر کے اوپر سے ویلڈنگ کر دی جائے گی۔ ان کے اوپر لکھ دیا جائے گا 'خطرناک مادہ'۔ اور پھر یہ ڈرم سمندر کے حوالے کر دیے جائیں گے۔ اتنی شاندار موت کے حوالے کرنے کا پروگرام تمہارے لیے کسی نے نہیں بنایا ہوگا، کیوں کیا خیال ہے؟"

"ہاں، شاید ہم تو بس ایک بات جانتے ہیں اور وہ یہ کہ موت بہرحال ایک دن آ کر رہے گی۔ کاش، تم یہ بھی بتا دیتے کہ ہم سے دشمنی کیا ہے؟"

"اس وقت تک ہوتا یہ رہا ہے کہ تم لوگوں سے ساری باتیں معلوم کر لیتے ہو۔ اور آخری لمحات میں کسی نہ کسی طرح بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو جاتے ہو اور پھر ان معلومات کے بل بوتے پر اصل آدمی کو گرفتار کر لیتے ہو، لیکن اس مرتبہ ایسا نہیں ہوگا۔ اسی لیے میں نے تمہیں یہاں پکڑ بلوایا ہے، تاکہ اپنی آنکھوں کے سامنے

تمہیں دوسری دنیا کی طرف جاتے دیکھ سکوں اور یہ اطمینان محسوس
کر سکوں کہ تم اب واپس آکر میرے لیے پریشانی کا باعث نہیں
بنو گے ۔ فرض کیا اگر تم کسی نہ کسی طرح بچ نکلنے میں کامیاب
بھی ہو جاتے ہو تو بھی تم مجھ تک نہیں پہنچ سکو گے، کیوں کہ
تم نہیں جانتے، میں تمہیں کیوں ہلاک کرنا چاہتا ہوں۔" باس
نے کہا۔

"تو یہ بات ہے ۔ خیر، کوئی بات نہیں، ہم دوسری دنیا
میں جا کر تو تمہارے پروگرام سے با خبر ہو ہی جائیں گے ۔ فکر نہ
کرو، جاتے ہی ابا جان کے خواب میں آکر انہیں ساری بات
بتا دیں گے اور تمہارے گلے میں پھانسی کا پھندا نظر آئے گا۔"
محمود بولا۔

"ابا جان اور امی جان کی بات نہ کرو۔ رات ان کی جیپ
پر بم مارا جا چکا ہے۔ جیپ کے پرخچے اڑ گئے تھے ۔ ظاہر ہے،
ان لوگوں کے بھی جیپ کے ساتھ پرخچے ہی اڑ سکتے تھے ۔
یہ تو ہو نہیں سکتا تھا کہ جیپ کے تو پرخچے اڑ جائیں اور وہ
محفوظ رہیں۔"

"نہیں۔" محمود، فاروق اور فرزانہ ایک ساتھ چیخ اٹھے لیکن
وہ تینوں خوب جانتے تھے کہ ان کی یہ چیخ مصنوعی ہے ۔ ان کے
والد اتنا تر نوالہ نہیں تھے ۔ اس قسم کے دعوے ان کے بارے

میں پہلے بھی کئی بار کیے جا چکے تھے۔
کمرے میں رکھے فون کی گھنٹی گنگنا اٹھی ۔ باس نے آگے بڑھ
کر ریسیور اٹھا لیا اور کان سے لگاتے ہوئے بولا:
"ہیلو، کون بول رہا ہے۔" یہ کہہ کر وہ دوسری طرف کی
بات سننے لگا ۔ اچانک اس کے منہ سے حیرت زدہ انداز میں نکلا:
"نہیں۔"
چند سیکنڈ تک وہ پھر دوسری طرف کی بات سنتا رہا، پھر
بولا:
"یہ ۔ آخر یہ ہوا کیسے ۔ میں، میں تم لوگوں کو زندہ نہیں
چھوڑوں گا، کتو۔" اس نے چیخ کر کہا۔ ایسے میں استاد کی
پوری توجہ بھی باس کی طرف ہو گئی ۔ یہی وہ وقت تھا، جس
کا بہت دیر سے محمود کو انتظار تھا ۔ اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ،
استاد کے ہاتھ پر ایک زور دار جھپٹا مارا اور پستول چھینتے ہوئے
دوسری طرف نکل گیا۔ اس سے پہلے کہ باس کو معلوم ہو سکتا کہ
کیا ہوا اور استاد کوئی جوابی کارروائی کر سکتا، محمود نے ٹریگر
دبا دیا اور پھر پستول کی نالی سے نکلنے والی باریک دھار سب
سے پہلے باس کے سر سے ٹکرائی ۔ اس کے بعد استاد کی
باری آئی، پھر باقی لوگ بھی گرتے چلے گئے۔

صرف پانچ سیکنڈ میں یہ سب کچھ ہو گیا — دوسرے ہی لمحے
محمود نے نعرہ لگایا :
"بھاگو۔"

وہی کار

"ہیلو سر" — اکرام کہہ رہا تھا : "ان نمبروں کی کار ہوٹل آبشار
کے مینجر کی ثابت ہوئی ہے۔"
"ہوٹل آبشار کا پتا اور مینجر کا نام؟" انہوں نے پوچھا۔
"یہ شارع آبان پر واقع ہے — بہت بڑا اور مشہور ہوٹل
ہے — مینجر کا نام آزاد راہی ہے۔"
"محمود، فاروق اور فرزانہ کی تلاش کے سلسلے میں کیا ہو
رہا ہے۔"
"تمام مشکوک جگہوں پر چھاپے مارے جا رہے ہیں — آئی۔
جی صاحب خود اس کام میں دل چسپی لے رہے ہیں۔"
"خوب — اچھا تو میں ہوٹل آبشار جاتا ہوں۔ ذرا دیکھوں
تو سہی، آزاد راہی کی کار اس عورت کے ہاتھ کس طرح لگ گئی۔"
"ٹھیک ہے سر، اور ہاں، وہ ٹکڑا ماہرین کے حوالے کر دیا ہے۔
پہلی نظر میں ہی انہوں نے بتا دیا ہے کہ بم غیر ملکی ساخت کا تھا،

اور بہت خطرناک بھی۔ باقی معلومات وہ پوری طرح تحقیق کرنے کے
بعد دیں گے۔ کیا میں بھی آپ کے ساتھ چلوں سر؟"

"شکریہ، میں تنہا ہی جانا پسند کروں گا۔ ان لوگوں کو
ہوشیار کرنا نہیں چاہتا" انہوں نے کہا اور ریسیور رکھ دیا۔
بیگم کو خدا حافظ کہتے ہوئے باہر نکل آئے۔ اب ان کی کار پوری
رفتار سے شارع آبان کی طرف جا رہی تھی۔ یہ سڑک شہر سے باہر
لے جاتی تھی اور ہوٹل بھی شہر کے گویا ایک کنارے پر واقع
تھا۔ وہاں تک پہنچنے میں انہیں آدھ گھنٹا لگا۔ کار کو مناسب
جگہ پر کھڑا کرنے کے بعد وہ ہال میں داخل ہوئے۔ ہال کھچا کھچ بھرا
تھا۔ انہوں نے لوگوں پر سرسری نظر ڈالی اور کاؤنٹر کی طرف
بڑھے۔

"مجھے مسٹر آزاد راہی سے ملنا ہے"

"کیا آپ نے ملاقات کا وقت لے رکھا ہے؟" کلرک نے
پوچھا۔

"نہیں تو، کیا ان سے ملاقات کے لیے وقت لینا پڑتا ہے؟"
انہوں نے حیران ہو کر پوچھا۔ کیونکہ ایک ہوٹل کے مینجر سے تو
ہوٹل میں کوئی بھی مل سکتا تھا۔

"جی ہاں، اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ بہت مصروف رہتے ہیں۔
وقت کے بغیر آپ صرف ان کے اسسٹنٹ سے مل سکتے ہیں" اس

نے کہا۔

"چلیے، ان سے ہی ملا دیں"

"وہ ابھی تشریف نہیں لائے۔ چند منٹ تک آ جائیں گے۔
آپ انتظار فرمائیں"

"لیکن میں بیٹھوں کہاں، پورا ہال تو پُر ہے"

"جی ہاں، یہ تو ہے۔ آپ سٹول پر بیٹھ جائیں۔ ابھی کوئی میز
خالی ہو جاتی ہے" اس نے کہا۔ اور وہ سٹول پر بیٹھ گئے۔ اب جو
انہوں نے ہال میں بیٹھے لوگوں کو بغور دیکھا تو چونک اٹھے۔ ایک
میز پر انہیں عرفان فوزی بیٹھے نظر آئے۔ یہ وہی تھے، جنہوں نے
انہیں جیپ تباہ ہونے پر لفٹ دی تھی، یعنی سائنس دان صاحب۔
ان کی میز پر بھی تین آدمی اور تھے؛ البتہ ایک میز پر صرف ایک
آدمی بیٹھا تھا اور باقی تین کرسیاں خالی پڑی تھیں۔ یہ دیکھ کر
وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔

"کہاں چل دیے جناب، کیا نائب مینجر سے ملنے کا ارادہ ترک
کر دیا"

"ایسی کوئی بات نہیں۔ اس میز پر تین کرسیاں خالی ہیں۔ میں
ان سے اجازت لے کر وہاں بیٹھتا ہوں۔ جوں ہی نائب مینجر آئیں،
مجھے اطلاع دے دیں"

"لیکن جناب، میں آپ کو اس میز پر بیٹھنے کا مشورہ نہیں

دوں گا۔"

"کیوں؟" وہ بولے۔

"اس لیے کہ وہ میز انھوں نے صرف اپنے لیے مخصوص کرا رکھی ہے۔"

"تو کیا ہوا؟" یہ کہہ کر وہ تیز تیز قدم اٹھاتے اس میز کی طرف بڑھے۔ کلرک کا ہاتھ انہیں روکنے کے لیے اٹھا اور اٹھا ہی رہ گیا۔ وہ میز پر اس لیے بھی بیٹھنا چاہتے تھے کہ عرفان فوزی کی میز اس جگہ سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھی۔

"معاف کیجیے گا جناب، کیا میں یہاں بیٹھ سکتا ہوں، کلرک مجھے بتا چکا ہے کہ یہ پوری میز آپ کے لیے مخصوص ہے، لیکن مشکل یہ ہے کہ اس وقت کوئی میز خالی نہیں ہے۔"

اس آدمی نے سر اٹھا کر ان کی طرف نہیں دیکھا، بلکہ پہلے کلرک کی طرف دیکھا اور انھوں نے صاف محسوس کیا کہ کلرک کے لیے اس کی آنکھوں شدید غصہ تھا، پھر وہ ان کی طرف مڑا اور بولا:

"میرے کچھ دوست آنے والے ہیں۔" یہ کہتے وقت اس نے ہاتھ کو مکّے کی صورت میں میز پر ٹکا دیا۔ مکّے کی صورت میں ہاتھ کی رگیں تنی ہوئی نظر آئیں۔ شاید بہت غصے میں تھا۔

"آپ کے دوست آگئے تو میں اُٹھ جاؤں گا۔" انھوں نے کہا۔

"اچھا تشریف رکھیے۔" یہ کہتے وقت اس نے پھر مکّا میز پر مارا؛ گویا ابھی اس کا غصہ رفع نہیں ہوا تھا۔

"مجھے انسپکٹر جمشید کہتے ہیں۔" انھوں نے اپنا تعارف کرایا۔

"اوہو، یہ آپ ہیں۔ آپ کا تو بہت نام ہے۔ میں آذر بیگ ہوں۔ شاید آپ نے میرا نام سُن رکھا ہو۔"

"اوہ، کیوں نہیں جناب، آپ بھی مشہور و معروف ہستی ہیں۔ شہر کی ایک اہم ہستی، اور اس مرتبہ انتخابات میں حصہ لینے والے بھی ہیں۔ کیوں، میں غلط تو نہیں کہہ رہا۔"

"بالکل ٹھیک — یہ ہوٹل میری پسندیدہ جگہ ہے۔ میں یہاں اپنے دوستوں سے ملاقات کرتا ہوں۔"

"مجھے افسوس ہے، میں نے آپ کو تکلیف دی۔"

"کوئی بات نہیں۔" انھوں نے کہا: "آپ کے لیے کیا منگواؤں؟"

"کچھ نہیں، میں تو ذرا ہوٹل کے مینجر سے ملنے آیا تھا، لیکن اب شاید نائب مینجر سے ہی مل سکوں گا۔"

"ہاں، اس ہوٹل کا مینجر بہت مصروف رہتا ہے۔ ملاقات کا وقت مقرر کیے بغیر کسی سے نہیں مل پاتا — میں نے بھی اسے بہت کم موقعوں پر یہاں دیکھا ہے؛ حالاں کہ میں یہاں کا مستقل گاہک ہوں۔"

وہ خاموش ہو رہے — دراصل وہ تو عرفان فوزی اور اس کے
ساتھیوں کی گفت گو سننے کے لیے یہاں آ گئے تھے اور یہ اسی
صورت میں ہو سکتا تھا، جب وہ آذر بیگ سے بات چیت نہ کریں۔
ان کے خاموش ہونے پر وہ بھی خاموش ہو گئے اور عرفان فوزی والی
میز کی بات چیت کسی حد تک ان کے کانوں میں آنے لگی، لیکن
انہیں مایوسی ہوئی — عرفان فوزی اپنے دوستوں سے سائنس کی کسی
تازہ ایجاد پر گفت گو کر رہے تھے اور وہ اس گفت گو میں اس
درجے محو تھے کہ پوری دنیا سے بے خبر نظر آ رہے تھے۔ عین اسی
وقت ایک بیرا ان کی طرف آیا اور بولا:

"نائب مینجر تشریف لے آئے ہیں — آپ ان کے کمرے میں
جا کر ملاقات کر سکتے ہیں۔"

"شکریہ۔" انہوں نے کہا، پھر آذر بیگ سے بولے:

"میں نے آپ کو زحمت دی، امید ہے، معاف فرمائیں گے؟"

"اس میں زحمت کی کیا بات ہے۔" وہ مسکرائے اور وہ ان
سے ہاتھ ملاتے ہوئے بیرے کی رہنمائی میں نائب مینجر کے کمرے تک
پہنچے، وہ ایک نوجوان آدمی تھا۔ اس نے ڈھیلے ڈھالے انداز میں ان
سے ہاتھ ملایا اور بولا:

"جی فرمائیے، میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟"

"مجھے یہ معلوم کرنا ہے کہ مینجر صاحب سے کہاں ملاقات ہو سکتی

ہے۔" انہوں نے کہا۔

"کیا آپ ملاقات کا وقت لے چکے ہیں؟"

"جی نہیں، اگر ملاقات کا وقت لے چکا ہوتا تو آپ کی
خدمت میں کیوں حاضر ہوتا۔" انہوں نے بُرا سا منہ بنایا۔ وقت ضائع
ہونے پر ان کا موڈ ہمیشہ خراب ہو جاتا تھا۔

"سوری، اس صورت میں آپ ان سے نہیں مل سکتے، کیونکہ
میں خود بھی نہیں جانتا، وہ اس وقت کہاں ہیں۔"

"حیرت ہے، وہ مینجر ہیں یا ملک کے گورنر۔" انسپکٹر جمشید جھنجلا
اٹھے۔

"دیکھیے جناب، اگر ہوٹل سے متعلق کوئی کام ہے تو میں
حاضر ہوں۔"

"مجھے انسپکٹر جمشید کہتے ہیں اور میں ہر حال میں ان سے ابھی
اور اسی وقت ملنا چاہتا ہوں۔"

"کیا فرمایا، انسپکٹر جمشید — اوہ، آپ نے پہلے کیوں نہیں بتایا۔
آپ کو چاہیے تھا کہ کلرک کو اپنا نام بتا دیتے، وہ مجھے فون کر
دیتا اور میں یہ معلوم کرنے کی پوری کوشش کرتا کہ مینجر صاحب کہاں
مل سکتے ہیں۔" وہ ایک دم نرم پڑ گیا۔

"چلیے خیر، کوئی بات نہیں — اب معلوم کر لیں۔" انہوں نے کہا۔

"جی ہاں، کیوں نہیں۔" اس نے کہا اور فون پر جٹ گیا۔ اب

اس نے مختلف جگہوں پر فون کرنا شروع کیے۔ آخر پندرہ منٹ کی
مسلسل کوشش کے بعد وہ رابطہ قائم کرنے میں کامیاب ہو ہی گیا۔

"ہیلو سر، میں آپ کا خادم بول رہا ہوں۔ اس وقت میرے
دفتر میں انسپکٹر جمشید تشریف فرما ہیں اور وہ آپ سے ملاقات کرنے
کے خواہش مند ہیں، ابھی اور اسی وقت ۔۔۔ جی کیا فرمایا، جی جی،
بہت اچھا۔" یہ کہہ کر اس نے ریسیور رکھ دیا اور ان کی طرف مڑا:

"وہ یہیں آ رہے ہیں جناب"

"بہت بہت شکریہ" وہ بولے۔

"آپ کیا پینا پسند کریں گے؟"

"کچھ نہیں، ناشتا کر چکا ہوں۔ اب دوپہر کے کھانے سے
پہلے قطعاً کچھ نہیں کھا سکتا، یہی طبی اصول ہے۔" انہوں نے مسکرا
کر کہا۔

"جی۔ جی ہاں۔ بات تو ٹھیک ہے۔"

ایک بار پھر انہیں آدھ گھنٹے تک انتظار کرنا پڑا، تب کہیں
جا کر نائب مینجر کے دروازے پر ایک لمبے چوڑے قد و قامت کا آدمی
نظر آیا۔ اس کے چہرے پر ایک بھرپور مسکراہٹ ناچ رہی تھی۔ نہ جانے
کیوں انسپکٹر جمشید کو ایسا محسوس ہوا، جیسے اس نے یہ مسکراہٹ زبردستی
اپنے چہرے پر چپکائی ہے۔ شاید اسے اپنی مصروفیات چھوڑ کر آنا
ناگوار گزرا تھا۔

"ہیلو، آپ ہی انسپکٹر جمشید ہیں؟"

"جی ہاں۔" نائب مینجر نے جلدی سے کہا۔

"مجھے آزاد راہی کہتے ہیں۔ اس ہوٹل کا مینجر ہوں۔ فرمائیے،
آپ کو مجھ سے ایسا کیا کام آ پڑا۔"

"آپ کے پاس کتنی کاریں ہیں، ان کے نمبر کیا کیا ہیں؟"

"اس سوال کا جواب تو آپ کو میرے نائب بھی دے سکتے
تھے۔ راشد عباس، کیا یہ سوال انہوں نے آپ سے نہیں پوچھا تھا؟"
مینجر نے غرا کر کہا۔

"جج، جی نہیں سر۔ یہ تو بس آپ سے ملاقات کرنا چاہتے تھے۔"
اس نے بوکھلا کر کہا۔

"ہاں یہ ٹھیک ہے، میں یہ سوالات صرف آپ سے کرنا چاہتا
تھا۔"

"خیر، لیکن میں حیران ہوں، آپ یہ سوالات کیوں کر رہے ہیں۔"
اس کے لہجے میں ذرا بھی حیرت نہیں تھی۔

"پہلے آپ میری بات کا جواب دیں، پھر میں وجہ بھی بتا دوں
گا۔" انہوں نے بھی خشک لہجے میں کہا۔

"میرے پاس دو کاریں ہیں۔ ان کے نمبر ۵۵۶ ایل اور ۲۶۰۵
ایل ڈی ہیں۔"

"لیکن آپ کی ایک کار کے نمبر ۲۹۴۹ ایم بی بھی ہیں۔" انہوں نے

اس کی طرف بغور دیکھا۔

"٣٩٤١ ایم بی" اس کے منہ سے بے ساختہ انداز میں نکلا، پھر جلدی سے بولا:

"اس نمبر کی کار بہت دن پہلے بے کار ہو گئی تھی۔ اب استعمال کے قابل نہیں رہی"۔

"وہ خراب کار کہاں ہے؟" انہوں نے تیزی سے سوال کیا۔

"میرے گھر اور کہاں"۔

"ٹھیک ہے، میں اس کار کو دیکھنا چاہتا ہوں"۔

"آپ نے بتایا نہیں، معاملہ کیا ہے؟" وہ بولا۔

"ہاں ضرور سن لیجیے۔ رات میری جیپ پر ایک بم پھینکا گیا۔ بم پھینکنے والے کار نمبر ٣٩٤١ ایم بی پر بیٹھ کر فرار ہوئے، جب کہ آپ کہہ رہے ہیں، وہ کار خراب پڑی ہے"۔

"یہ بالکل ٹھیک ہے، آپ کو ضرور غلط فہمی ہوئی ہے۔ اس کار کے نمبر کچھ اور ہوں گے"۔

"نہیں، میں نے خود کار کے نمبر پڑھے تھے۔ آپ کو اسی وقت میرے ساتھ اپنے گھر تک چلنا ہوگا اور کار مجھے دکھانا ہوگی" انہوں نے کہا۔

"دیکھیے، میں ایک بہت مصروف آدمی ہوں۔ اس وقت آپ کے ساتھ نہیں جا سکتا۔ آپ کل شام چھ بجے آ جائیے۔ میں کار

آپ کو دکھا دوں گا"۔

"جی نہیں، میرے پاس اتنا وقت کہاں۔ آپ کو اسی وقت کار دکھانا ہوگی" انہوں نے سخت لہجے میں کہا۔

"کیا میں ایسا کرنے کے لیے قانونی طور پر پابند ہوں؟"

"ہاں بالکل، یہ بہت سنگین معاملہ ہے"۔

"اچھی بات ہے چلیے" اس نے ایک لمبا سانس کھینچا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ انسپکٹر جمشید بھی اٹھے اور دونوں دروازے کی طرف بڑھے ہی تھے کہ ٹھٹک کر رک گئے۔ اسی وقت ایک زنانہ آواز ان کے کانوں سے ٹکرائی:

"مجھے معلوم ہوا ہے، آپ یہاں ہیں۔ ارے....."

عورت بھی ٹھٹک کر رہ گئی۔ اس کی نظریں پہلے آزاد راہی پر پڑی تھیں۔ اسی وقت اس نے یہ جملہ کہا تھا، لیکن جوں ہی اس کی نظریں انسپکٹر جمشید سے ٹکرائیں۔ اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

یہ بالکل وہی عورت تھی جو رات کار میں ملی تھی اور جس نے اپنا نام زہرا بخاری بتایا تھا۔ دور بین اب بھی اس کے ہاتھ میں جھول رہی تھی۔ چند سیکنڈ کے لیے موت کی خاموشی چھائی رہی۔ وہ سب پتھر کے بتوں کی طرح خاموش تھے۔ آخر انسپکٹر جمشید کی آواز گونجی۔

"تشریف لائیے، آپ دروازے پر کیوں رک گئیں۔ مسٹر آزاد راہی

یہ شاید آپ سے ملنے یہاں آگئی ہیں، لہٰذا جانے سے پہلے آپ ان سے مل لیں۔ میں نہیں چاہتا، میری وجہ سے انہیں انتظار کرنا پڑے۔ ویسے آپ کی اطلاع کے لیے عرض کر دوں کہ یہ وہی صاحبہ ہیں، جن کا میں ابھی ابھی ذکر کر رہا تھا۔ رات کار نمبر ۳۹۴۹ ایم بی میں یہی تھیں اور آپ کہہ رہے ہیں کہ اس نمبر کی کار خراب پڑی ہے۔"

"آؤ سیمی، بیٹھو۔ آپ بھی تشریف رکھیے انسپکٹر صاحب، ابھی معاملہ صاف ہوا جاتا ہے۔" آزاد راہی نے پلٹتے ہوئے کہا۔

تینوں بیٹھ گئے۔ نائب مینجر تیزی سے نظریں گھما رہا تھا۔

"تو ان کا نام سیمی ہے۔ رات انہوں نے اپنا نام زہرا بخاری بتایا تھا۔ انہوں نے یہ بھی کہا تھا کہ ان کے مرحوم شوہر کا نام ڈاکٹر مجید بخاری تھا۔ انہوں نے اپنا جو پتا بتایا تھا۔ وہ بھی غلط نکلا۔ اس سلسلے میں آپ دونوں کیا کہتے ہیں؟"

"سیمی، کیا ان کا بیان درست ہے؟" آزاد راہی بولا۔

"میری بات کو جھٹلانے سے پہلے محترمہ زہرا بخاری عرف سیمی، یہ ضرور سوچ لیجیے گا کہ دو چشم دید گواہ عدالت میں گواہی دینے کے لیے تیار ہیں۔ عرفان فوزی سائنس دان اور میری بیوی۔" انسپکٹر جمشید بول اٹھے۔

"سیمی، جواب دو، یہ کیا ماجرا ہے؟"

"یہ ٹھیک ہے سر، میں رات ماڈل سٹی سے آ رہی تھی۔ آپ کو تو معلوم ہی ہے۔ وہاں میرے رشتے دار رہتے ہیں۔ میں ان سے ملنے گئی تھی۔ یہ پیچھے سے آئے اور میرا تعاقب کرنے لگے۔ آخر مجھے رکنا پڑا۔ تب انہوں نے مجھ سے میرا نام، پتا، کار کا نمبر اور ماڈل سٹی میں عزیزوں کا پتا معلوم کیا، انہوں نے اپنا تعارف بھی کرایا۔ میں نے اسی خوف کے پیش نظر کہ کہیں مجھے عدالتوں کے چکر نہ کاٹنا پڑیں، اپنا پتا غلط لکھوا دیا۔ نام بھی غلط بتایا، عزیزوں کا پتا بھی غلط لکھوا دیا۔"

"لیکن کار کے نمبر درست لکھوانا پڑے، کیونکہ وہ میں اپنی آنکھوں سے بھی پڑھ سکتا تھا۔" انسپکٹر جمشید نے طنز بھرے لہجے میں کہا۔

اس سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔

"چلیے، یہ تو ہوا۔ اب آپ کیا کہتے ہیں مسٹر آزاد راہی۔ آپ کی خراب کار یہ کس طرح چلانے کے قابل ہوگئیں۔"

"سیمی، تمہیں کتنی مرتبہ کہا ہے کہ اس خراب کار کو نہ چلایا کرو، کسی دن چوٹ کھا بیٹھو گی۔"

"غلطی ہوگئی سر، اب کبھی وہ کار نہیں چلاؤں گی۔"

"بات یہ ہے جناب۔" اب آزاد ان کی طرف مڑا: "بظاہر تو وہ کار بالکل ٹھیک ہے، لیکن اس کے انجن میں اچھی بھلی خرابی ہے،"

اس لیے میں نے اسے گیراج میں رکھ چھوڑا ہے۔ چونکہ میرے پاس دو اور بالکل نئی کاریں ہیں — اس لیے اسے ٹھیک کرانے کی ضرورت محسوس نہیں کی — یہ اور بات ہے کہ سیمی کو وہی کار پسند ہے اور میرے منع کرنے کے باوجود یہ وہی لے جاتی ہے:

"آپ دونوں کا آپس میں رشتہ کیا ہے؟"

"یہ میری سیکرٹری ہیں۔ ہوٹل کے کام کاج میں میرا ہاتھ بٹاتی ہیں۔"

انسپکٹر جمشید نے پل بھر کے لیے سوچا — ان لوگوں نے بات خوب بنائی تھی — وہ اب انہیں کسی طرح بھی بم والے معاملے میں مجرم ثابت نہیں کر سکتے تھے — صرف ایک بات رہ جاتی تھی؛ چناں چہ اس کے بارے میں وہ سوچتے ہوئے بولے:

"ٹھیک ہے، میں یہ تمام باتیں درست تسلیم کرلوں گا، لیکن کار تو آپ کو دکھانا ہی ہوگی — ذرا میں بھی تو دیکھوں کہ اس کے انجن میں کیا خرابی ہے۔"

"ضرور دیکھیے، آؤ سیمی، انہیں چل کر کار دکھا دیں۔"

"ضرور ضرور، کیوں نہیں۔" سیمی نے کہا۔

تینوں کمرے سے نکل کر ہال میں آئے اور بیرونی دروازے کی طرف چلے۔ انسپکٹر جمشید نے محسوس کیا۔ آزاد راہی کو دیکھتے ہی عملے کے تمام لوگ سہم سے گئے تھے — عرفان فوزی اب ہال میں

نہیں تھے۔ باہر نکل کر انسپکٹر جمشید اپنی کار کی طرف بڑھے۔

"ہم دونوں اپنی کار میں جائیں گے۔" آزاد بولا۔

"کیوں، میری کار میں کیا حرج ہے؟" انسپکٹر جمشید نے جلدی سے کہا۔

"کوئی حرج نہیں۔ لیکن میں اپنی کار میں ہمیشہ سفر کرنا پسند کرتا ہوں۔"

"تو میں بھی آپ لوگوں کے ساتھ بیٹھ جاتا ہوں۔"

"ہم شاید واپس نہ آئیں۔" آزاد بولا۔

"کوئی بات نہیں، میں ٹیکسی سے ہوٹل تک آجاؤں گا۔" انہوں نے کہا۔

"بہت اچھا، آئیے۔" آزاد نے اپنی بالکل نئی کار کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔

تینوں کار میں بیٹھ گئے — آزاد نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی۔ آدھ گھنٹے کے سفر کے بعد وہ ایک عظیم الشان کوٹھی کے اندر داخل ہوئے۔ روش پر کار روک دی گئی — وہ نیچے اترے — آزاد راہی گیراج کی طرف بڑھا۔ اندر وہی کار کھڑی تھی، جسے رات سیمی یا زہرا انجاری چلا رہی تھی —

دھار کا شکار

تینوں اندھا دھند دروازے کی طرف بھاگے اور پھر کمرے سے نکل کر برآمدے میں دوڑنے لگے۔ یہاں تک کہ بیرونی دروازے تک پہنچ گئے۔ انہوں نے اسے کھولنے کی کوشش کی، لیکن اس میں تو تالا لگا ہوا تھا۔ وہ ٹھٹک کر رہ گئے۔

"کاش، میرے ہاتھ میں اس وقت گولیوں والا پستول ہوتا۔" محمود بڑبڑایا۔

"جو کچھ کرنا ہے، جلدی کرو۔ ہم نہیں جانتے، وہ لوگ کتنی دیر تک بے ہوش رہیں گے۔ عمارت میں کچھ اور لوگ بھی ہو سکتے ہیں۔ انہوں نے ہمارے دوڑتے قدموں کی آواز سن لی ہوگی۔" فرزانہ نے بوکھلائی ہوئی آواز میں کہا۔

"فکر نہ کرو۔ میرے ہاتھ میں بے ہوش کرنے والا پستول موجود ہے۔"

"ایسے پستول ان لوگوں کے پاس بھی ہو سکتے ہیں۔" فاروق

نے کہا۔

"دروازے کی چابی کے لیے ہمیں پھر اسی کمرے میں جانا پڑے گا، اس کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ چابی ضرور باس یا استاد کی جیب میں ہوگی۔"

"تو پھر آؤ، باتوں میں وقت کیوں ضائع کیا جائے۔" فرزانہ نے کہا اور واپس مڑ کر پھر دوڑ لگا دی۔ تینوں آدھ منٹ بعد ہی پھر اسی کمرے میں داخل ہوئے۔ باس اور اس کے ساتھی ابھی تک بے ہوش پڑے تھے۔ انہوں نے جلدی جلدی باس اور استاد کی جیبوں کو ٹٹولا اور آخر باس کی جیب سے چابیوں کا ایک چھلا تلاش کرنے میں کامیاب ہو ہی گئے۔ وقت بہت نازک تھا۔ ایک ایک لمحہ قیمتی تھا۔ انہوں نے ایک بار پھر اندھا دھند بیرونی دروازے کی طرف دوڑ لگا دی۔ انہیں نہیں معلوم تھا کہ اس دروازے کے بعد انہیں باہر نکلنے کے لیے کتنا فاصلہ طے کرنا تھا۔ وہ تو بس کسی طرح دروازہ کھول کر نکل جانا چاہتے تھے۔ محمود نے تالے کے سوراخ میں چابیاں لگانا شروع کیں اور آخر کلک کی آواز کے ساتھ تالا کھل گیا۔ ساتھ ہی ان کے سروں پر گویا قیامت ٹوٹ پڑی۔ بے ہوش ہونے سے پہلے وہ یہ دیکھنے میں کامیاب ہو گئے کہ ان کے سروں کی خبر ڈنڈوں سے لی گئی تھی اور ڈنڈے پانچ چھ آدمیوں کے ہاتھوں میں تھے۔

دوبارا ہوش آیا تو وہ اسی کمرے میں تھے۔ باس اور اس
کے ساتھی بھی ہوش میں آ چکے تھے۔ انہیں ہوش میں آتے دیکھ
کر باس مسکرایا۔

"بہت خوب، میں نے کہا تھا نا، تم لوگ ساری باتیں معلوم
کر کے آخری لمحات میں بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو جاتے ہو، اس
لیے میں سب کچھ اپنی آنکھوں کے سامنے کرانا چاہتا تھا اور مجھے
یہ ڈر بھی تھا کہ کہیں میرے ساتھ بھی ایسا ہی نہ ہو، لہٰذا میں نے
احتیاطاً وہ پانچ آدمی دروازے پر مقرر کر دیے تھے اور تالا لگا
کر چابیاں جیب میں رکھ لی تھیں۔ اب اگر میں اس قدر احتیاط نہ
کرتا اور ساری بات بھی تمہیں بتا دیتا تو کسی صورت بھی گرفتاری سے
نہیں بچ سکتا تھا، لیکن بات دراصل یہ تھی کہ میں ایک عرصے سے
تم لوگوں کی حرکات نوٹ کر رہا ہوں۔ ایک ایک معلومات حاصل کی ہیں
میں نے تمہارے بارے میں — یہی وجہ ہے کہ تم ایک بار پھر
بے بسی کی حالت میں اس کمرے میں موجود ہو۔ یقین کر لو اس بار
تم بچ نہیں سکو گے۔ ان ڈرموں میں تمہیں بند ہونا ہی پڑے گا۔"

"ہم ان ڈرموں میں بند ہونے کے لیے تیار ہیں، لیکن یہ تو
بتا دیں کہ یہ سارا جھنجھٹ ہے کس لیے۔"

"پھر وہی، میں نے کہا نا، تمہیں ایک لفظ بھی نہیں بتایا جا
سکتا — اگرچہ میری احتیاطی تدابیر اس وقت بھی بہت مضبوط ہیں،

لیکن میں تمہاری طرف سے پھر بھی سو فیصد مطمئن نہیں۔"

"شاید آپ ہم سے بہت ہی زیادہ ڈرے ہوئے ہیں، خیر
نہ بتائیں اور اپنے پروگرام پر عمل کریں۔ دیکھنا تو یہ ہے کہ اس
اس بار کیا ہوتا ہے، آپ کامیاب ہوتے ہیں یا قدرت ہمیں آپ
کے ہاتھوں سے صاف بچا لے جاتی ہے۔"

"اچھی بات ہے — چلو بھئی باندھ ڈالو ان کے ہاتھ اور
پاؤں۔"

تین آدمی رسیاں لے کر ان کی طرف بڑھنے لگے۔

"ہوشیار، ہم رسیاں نہیں بندھوائیں گے۔" محمود نے گویا
اعلان کیا۔

"بالکل ٹھیک — بھلا ہمیں کیا ضرورت ہے رسیاں بندھوانے
کی — رسیاں بندھوائیں ہمارے دشمن۔" فاروق بولا۔

"تمہارا مطلب ہے، یہ لوگ — ہاں رسیاں بندھوائیں یہ
لوگ۔" فرزانہ نے کہا۔

تینوں بھڑک کر ادھر ادھر ہو گئے۔ رسیاں باندھنے کے لیے
بڑھنے والوں نے پریشان ہو کر ان کی طرف دیکھا، پھر باس کی
طرف مڑے۔

"یہ لوگ اس طرح قابو نہیں آئیں گے۔ کمرے کا دروازہ
بند رکھو اور اس کے بعد سب مل کر انہیں قابو میں کر لو۔"

باس نے ترکیب بتائی۔

"ترکیب شاندار ہے، لیکن ہم بھی ترکیبیں سوچنے میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔ خاص طور پر ہماری بہن — کیوں فرزانہ، تمہارا بے مثال ذہن اس وقت کوئی ترکیب اگل رہا ہے یا نہیں۔" فاروق نے شوخ لہجے میں کہا۔

"فکر نہ کرو، ترکیب تیار ہے۔"

ابھی فرزانہ کے منہ سے یہ جملہ نکلا ہی تھا کہ فون کی گھنٹی بجی — باس نے فون کی طرف دیکھا اور پھر استاد کی طرف اشارا کیا — استاد نے آگے بڑھ کر ریسیور اٹھا لیا اور بولا:

"ہیلو، کون صاحب؟" یہ کہہ کر دوسری طرف کی گفت گو سننے لگا، پھر باس سے بولا:

"باس، آپ کا فون ہے، کوئی ضروری معاملہ ہے۔"

"لاؤ، میں دیکھتا ہوں۔" اس نے کہا اور پھر ریسیور لے لیا، پھر دوسری طرف کی گفت گو سنتا رہا، آخر بولا:

"اچھا، میں آرہا ہوں، اسے روکے رکھو۔"

یہ کہہ کر اس نے ریسیور رکھ دیا اور استاد سے بولا:

"مجھے ایک ضروری کام سے جانا پڑ گیا ہے — میں ایک گھنٹے تک واپس آجاؤں گا۔ پوری طرح چوکس رہنا۔"

"آپ فکر نہ کریں سر۔" استاد نے کہا اور باس کمرے سے

نکل گیا —

"افسوس، کچھ دیر کے لیے تمہاری زندگی اور بڑھ گئی۔"

"بڑھ نہیں گئی بے وقوف استاد — زندگیاں تو پہلے ہی اوپر طے ہوتی ہیں۔ ہر شخص اپنی زندگی کے مطابق جیتا ہے اور پھر مر جاتا ہے — اگر آج کا دن ہماری زندگیوں کا آخری دن ہے، تو دنیا کی کوئی طاقت ہمیں بچا نہیں سکتی اور اگر ابھی ہماری زندگیاں باقی ہیں تو دنیا کی کوئی طاقت ہمارا بال بھی بیکا نہیں کر سکتی۔" محمود نے بلند آواز میں کہا۔

"بہت خوب! تم نے مجھے بے وقوف کہا — اگر باس نے تمہارے بارے میں یہ نہ کہا ہوتا کہ وہ اپنی آنکھوں کے سامنے تمہیں مرتا ہوا دیکھنا چاہتے ہیں تو اسی وقت میں تم تینوں کو موت کے گھاٹ اتار دیتا۔"

"خدا بھلا کرے باس کا، جس نے....." فاروق کہہ رہا تھا کہ فرزانہ نے ٹوک دیا:

"تمہارا دماغ تو نہیں چل گیا — ملک اور قوم کے دشمن کو دعا دے رہے ہو۔"

"اوہ، معاف کرنا، واقعی میرا دماغ چل گیا ہوگا — ان حالات میں دماغ نہیں چلے گا تو اور کیا چیز چلے گی۔" فاروق نے بوکھلا کر کہا۔

"میرے خیال میں ہمارے پاس ایک بہت اچھا موقع ہے۔" اچانک محمود نے کہا۔

"کیا مطلب، کیسا موقع — مجھے تو دُور دُور تک کوئی موقع ووقع نظر نہیں آ رہا۔" فاروق نے حیران ہو کر کہا۔

"تو اپنی آنکھوں کا علاج کراؤ، کیوں فرزانہ ٹھیک ہے؟" محمود کی آواز شوخ تھی۔

"ہاں، بالکل ٹھیک ہے۔" فرزانہ مسکرائی۔

"بالکل ٹھیک تو اس طرح کہہ رہی ہو، جیسے محمود کی بات سمجھ ہی تو گئی ہو۔" فاروق جل کر بولا۔

"ہاں، سمجھ گئی ہوں — اسی لیے تو کہہ رہی ہوں۔ ہمیں قدرت نے ایک شاندار موقع دیا ہے۔ یہ لوگ ہمیں جان سے نہیں مار سکتے، کیونکہ ان کے باس کا حکم یہی ہے، لہذا ہم آزادی کے لیے ایک شاندار قسم کی جدوجہد تو کر ہی سکتے ہیں۔" فرزانہ بولی۔

"کیا مطلب؟" استاد زور سے چونکا۔

"ہم میدان میں نکلتے ہیں استاد، ہم پر قابو پا لو۔" محمود نے اسے دعوت دی۔

"واہ، کتنی اچھی دعوت ہے۔" فاروق بولا اور فرزانہ مسکرائے بغیر نہ رہ سکی۔

تینوں تین مختلف سمتوں میں دوڑ پڑے اور پھر ٹراکا مرغوں

کے انداز میں جھک گئے، جیسے کہہ رہے ہوں، "آؤ آؤ، ہو جائیں دو دو ہاتھ۔"

"خبردار، تم لوگ شاید یہ بات بھول رہے ہو کہ میرے پاس دماغ کو سن کر دینے والا پستول موجود ہے۔" استاد نے بلند آواز میں کہا۔

"ارے بہت دیکھے ہیں ایسے پستول، نکال لو اپنا پستول، دبا دو ٹریگر۔" فاروق نے کسی بوڑھے جنگی کے انداز میں کہا۔

"تو پھر یہ لو۔" اس نے بلا کی پھرتی پستول جیب سے نکالا اور محمود کی طرف کر کے ٹریگر دبا دیا۔ محمود پہلے ہی ہوشیار تھا۔ بلا کی رفتار سے ایک طرف چھلانگ لگا گیا — دھار فرش پر پڑی۔ استاد نے بھنا کر پستول کا رُخ پھوپلاس کی طرف کیا اور اس بار وہ استاد کے ایک ساتھی کے پیچھے دبک گیا — نتیجہ یہ کہ دھار اس ساتھی پر پڑی اور وہ چیخ مار کر گرا — یہ دیکھ کر استاد چکرا گیا۔ اس نے سوچا، یہ لوگ تر نوالہ نہیں ہیں — ان کے ساتھ لڑائی کرتے وقت عقل اور ہوش کی ضرورت زیادہ ہے؛ چنانچہ اس بار اس نے چال چلی — محمود کا نشانہ لیا، لیکن پھر ٹریگر دبانے کا انداز اختیار کرتے ہی فرزانہ کی طرف رخ کر دیا، ساتھ ہی نالی میں سے دھار نکلی۔ فرزانہ بھی اناڑی نہیں تھی۔ پہلے ہی اس نے اسی قسم کی حرکت محسوس کر لی تھی، لہذا فوراً لوٹ لگا گئی۔

اس وقت تک استاد کے کسی اور ساتھی نے کوئی حرکت نہیں
کی تھی، نہ کسی نے جیب سے اس جیسا پستول نکالا تھا؛ چناں چہ
انہیں یہ اندازہ لگانے میں دیر نہ لگی کہ دھار والا پستول ان لوگوں
میں سے صرف استاد کے ہی پاس ہے۔ یہ خیال آتے ہی وہ
اور بھی شیر ہو گئے۔ ادھر استاد نے تنگ آکر فاروق کو اپنا نشانہ
بنایا۔ اس کے سر کا نشانہ لیا اور دھار چھوڑ دی۔ فاروق فوراً نیچے
بیٹھ گیا — اور دھار اس کے اوپر سے گزر گئی۔

"بے وقوفو، کھڑے تماشا کیا دیکھ رہے ہو، ان پر ٹوٹ پڑو
اور بے بس کر دو — باس کے آنے تک ان کے ہاتھ پاؤں رسیوں
میں جکڑ دو۔" آخر اس نے جھلا کر کہا۔

"بہت اچھا استاد، ہم نے تو اس لیے دخل نہیں دیا تھا کہ
آپ ان لوگوں کو تنہا ہی کافی ہو جائیں گے۔ اب آپ نے حکم
دے دیا ہے تو یہ لیجیے — ہم ابھی ان کی چٹنی بنائے دیتے ہیں۔"

"چٹنی کھائے تو ہمیں بھی بہت دن ہو گئے۔" فاروق بولا۔

"فکر نہ کرو، تمہاری دعوت تو پہلے کریں گے۔" ان میں سے
ایک نے کہا۔

اب وہ سب مل کر ان پر حملہ آور ہوئے۔ استاد اپنا پستول
کھول کر اس میں کچھ کرنے لگا۔ شاید وہ خالی ہو گیا تھا۔ اس کے
ساتھیوں کی تعداد اس وقت چھ کے قریب تھی؛ گویا ان میں سے

ہر ایک کے حصے میں دو دو آدمی آ گئے۔ ایک آدمی کا دو آدمیوں
سے لڑنا کافی مشکل ہوتا ہے۔ جب کہ استاد اور اس کے ساتھیوں
جیسے لوگوں کا کام ہی دن رات لڑتے بھڑتے رہنا ہو۔ ادھر ان کے
لیے بھی یہ حالات نئے نہیں تھے، اس لیے گھبراہٹ ان کے پاس
بھی نہ پھٹکی۔ انہیں ایک اطمینان یہ تھا کہ وہ لوگ انہیں جان سے
مارنے کی کوشش نہیں کریں گے؛ چنانچہ اور بھی بے جگری سے اچھل
کود مچا رہے تھے۔ ایسے میں استاد کی آواز سنائی دی:

"میں نے پستول دوبارا لوڈ کر لیا ہے — اب تم ایک طرف
ہٹ جاؤ، بلکہ میرے قریب آ جاؤ، تاکہ ان کی بجائے تم لوگ دھار
کا شکار نہ ہو جاؤ۔"

وہ کائی کی طرح چھٹ گئے — اب استاد دروازے کے عین
سامنے کھڑا تھا؛ گویا وہ کمرے سے صرف اس صورت میں نکل سکتے تھے،
جب استاد کو ہٹا دیں اور اس کے ہاتھ میں دھار والا پستول تھا۔
وہ وہیں کھڑے رہ کر ان پر فائر کرتا رہتا، وہ اچھل کود مچا کر
بچتے ہی رہتے — تب بھی کمرے سے نکلنے کے امکانات بہت کم ہو
گئے تھے۔ تینوں نے مایوس ہو کر ایک دوسرے کی طرف دیکھا:

"ہم بلاوجہ خود کو تھکا رہے ہیں۔ جب تک باس نہیں آ
جاتا، ہمیں آرام کرنا چاہیے۔" فاروق نے گویا دونوں کو مشورہ دیا۔

"باس تو آنے کے بعد ہمیں ہمیشہ کے لیے آرام کرنے پر مجبور کر

دے گا؟" فرزانہ نے اسے گھورا۔

"پھر تم ہی بتاؤ، ہم کر کیا سکتے ہیں؟" فاروق نے کندھے اچکائے۔

"آر یا پار۔" محمود بولا۔

"آر یا پار، کیا مطلب؟"

"مطلب یہ۔" یہ کہہ کر اس نے بے تحاشا استاد کی طرف دوڑ لگا دی۔ استاد بوکھلا گیا۔ اس سے پہلے کہ ٹریگر دبا سکتا، محمود اس کے سینے سے جا ٹکرایا۔ اور کچھ اس زور سے ٹکرایا کہ وہ چاروں شانے چت نیچے گرا۔ محمود نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، دروازے سے باہر چھلانگ لگا دی۔ استاد کے ساتھی اس کے پیچھے دوڑے۔ فاروق اور فرزانہ اب بھلا کہاں رکنے والے تھے، وہ ان کے پیچھے دوڑ پڑے۔ استاد کچھ اس زور کا گرا کہ اٹھ ہی نہ سکا۔

"فاروق، یہ کیا پاگل پن ہے۔" فرزانہ نے دوڑتے دوڑتے کہا۔

"ک ک، کہاں؟" فاروق ہکلایا۔

"میرا مطلب ہے، باس کے آدمی محمود کے پیچھے ہیں اور ہم ان کے پیچھے، یہ کیا بات ہوئی؟"

"پھر ہم کیا کر سکتے ہیں؟"

"کیوں نہ کسی اور راستے پر ہو لیں اور باہر نکلنے کی کوشش کریں۔"

"بات تو ٹھیک ہے۔ آؤ پھر، ہم بائیں ہاتھ مڑ جاتے ہیں۔" فاروق نے کہا اور دونوں نے اپنا رخ بدل لیا۔

تین منٹ کی بھول بھلیوں کے بعد وہ پھاٹک تک پہنچنے میں کامیاب ہو سکے۔ دور دور تک کوئی نہیں تھا۔ محمود بھی کہیں نظر نہ آیا۔ ایسے میں وہ باہر نکلنے کے علاوہ کر ہی کیا سکتے تھے۔ پھاٹک سے باہر نکل کر انہوں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ یہ ایک شان دار کوٹھی تھی۔ نہ جانے محمود اور اس کے پیچھے آنے والے کہاں غائب ہو چکے تھے۔

"اب کیا کریں؟" فرزانہ بولی۔

"بھاگتے رہو۔ اور کیا کر سکتے ہیں۔"

"لیکن سڑک پر پہنچنے کے بعد بھاگتے رہنے کی کیا تک۔ اور پھر جب تک ہمیں یہ معلوم نہ ہو جائے کہ محمود کہاں ہے، اس وقت تک ہم اس کوٹھی سے دور کس طرح جا سکتے ہیں۔" یہ کہہ کر فرزانہ نے ایک بار پھر مڑ کر دیکھا۔ گیٹ پر کسی کے نام کی تختی نہیں لگی تھی۔ آس پاس اور بھی کوٹھیاں تھیں، لیکن ان کا درمیانی فاصلہ بہت تھا۔ مطلب یہ کہ یہ علاقہ کچھ غیر آباد سا تھا۔ ایک درخت کے پیچھے سے اچانک محمود کی آواز سنائی دی:

"کدھر منہ اٹھائے چلے جا رہے ہو، کیا مجھے ساتھ نہیں لو گے؟"

وہ ٹھٹک کر رک گئے ۔ مڑ کر دیکھا تو محمود کھڑا مسکرا رہا تھا۔

"اور وہ کہاں ہیں جو تمہارا پیچھا کر رہے تھے؟"

"وہ، انہیں میں نے آگے چلتا کر دیا۔" محمود مسکرایا۔

"کیسے چلتا کر دیا؟" وہ حیران ہو کر بولا۔

"بھئی میں کوٹھی سے نکلتے ہی اس درخت کے پیچھے چھپ گیا۔ وہ یہ سمجھے کہ میں آگے نکل گیا ہوں، لہذا دوڑتے چلے گئے۔ اور شاید اب تک دوڑے جا رہے ہوں گے۔"

"اس کا مطلب ہے، ہم اس طرف سے واپس نہیں جا سکیں گے۔"

"سڑک چھوڑ کر ہم کسی بھی سمت سے جا سکتے ہیں، لیکن پہلے تو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ ہم شہر کے کون سے حصے میں ہیں اور ہمیں اپنے گھر جانے کے لیے کون سی سمت جانا چاہیے۔"

"آؤ، اسی طرف چلتے ہیں۔ اب وہ لوگ ہمیں نہیں پکڑ سکیں گے۔"

"پہلے تو اس کوٹھی کو بغور دیکھ لو۔ ہمیں اس تک پھر بھی تو پہنچنا ہے۔" فرزانہ نے کہا۔

"ہوں، ٹھیک ہے۔" اور انہوں نے کوٹھی کو نظر بھر کر دیکھا۔ اب وہ اس کو پہچاننے میں غلطی نہیں کر سکتے تھے۔

آدھ گھنٹے بعد انہیں ایک ٹیکسی نظر آئی۔ ٹیکسی خالی تھی

اس لیے انہوں نے ہاتھ اٹھا دیا۔ اس کے رکتے ہی وہ اندر بیٹھ گئے اور بولے:

"ہمیں شہر جانا ہے۔"

"شہر، شہر ادھر کہاں؟ شاید آپ لوگ راستا بھول گئے ہیں۔"

"یہی سمجھ لیں، اور شہر جدھر ہے، ادھر ہی چلیں۔" فاروق بولا۔

ٹیکسی چل پڑی، لیکن اس کا رخ اسی سمت میں تھا، جس طرف سے وہ آئے تھے۔ جلد ہی انہیں پھر وہی کوٹھی نظر آئی۔ وہ اس کے سامنے سے گزر گئے۔ اسی وقت دوسری طرف سے ایک کار آتی نظر آئی۔ یہ دیکھ کر ان کی حیرت کی انتہا نہ رہی کہ کار میں ڈرائیونگ سیٹ کے ساتھ والی سیٹ پر ان کے والد بیٹھے تھے۔

اور ان کے بارے میں دشمنوں نے یہ دعویٰ کیا تھا کہ وہ ان کی جیپ پر بم مار کر ان کے اور جیپ کے پرخچے اڑا چکے ہیں۔ اگرچہ انہیں پہلے ہی یقین تھا کہ ایسا نہیں ہوا ہوگا، پھر انہیں زندہ سلامت دیکھ کر انہوں نے بے پناہ خوشی محسوس کی۔ ساتھ ہی فرزانہ نے ٹیکسی ڈرائیور سے کہا:

"ٹیکسی واپس موڑ لیجیے۔"

"کیوں، اب کیا ہوا؟"

"ایک ضروری کام یاد آگیا ہے۔ جلدی کیجیے۔"

ٹیکسی ڈرائیور نے انہیں گھور کر دیکھا اور پھر ٹیکسی موڑ لی،

پھر جونہی انہوں نے اگلی کار کو ایک کوٹھی میں داخل ہوتے دیکھا، محمود نے کہا:

"بس جناب، یہیں روک دیجیے۔"

"کیا مطلب؟"

"بس ہم یہیں اتریں گے۔ فاروق، بل ادا کر دو۔"

"لیکن آپ لوگوں کو تو شہر جانا تھا۔" ٹیکسی ڈرائیور کا مارے حیرت کے بُرا حال تھا۔

"جی ہاں، جانا تھا — اب بھی جانا ہے، لیکن اس کار میں ہمیں اپنے والد صاحب نظر آگئے ہیں، لہٰذا اب ان کے ساتھ چلے جائیں گے۔"

"ٹھیک ہے، تین روپے نوے پیسے دے دیں۔" ڈرائیور نے میٹر پر نظر ڈالی۔ فاروق نے جیب میں ہاتھ ڈالا، پھر دھک سے رہ گیا۔ جیب میں تو کچھ بھی نہیں تھا — شاید ان کی بے ہوشی کے دوران جیبیں خالی کر دی گئی تھیں۔ ان کے کھلونے بھی نکال لیے گئے تھے۔

"میری جیب خالی ہے۔"

"اور میری بھی۔ گویا انہوں نے جیبوں میں کچھ نہیں رہنے دیا۔ اب کیا کریں۔ انہیں تین روپے نوے پیسے کہاں سے ادا کریں۔"

"کیا معاملہ ہے، آپ لوگ کچھ عجیب عجیب باتیں کر رہے ہیں۔" ڈرائیور بھنا کر بولا۔

"بات دراصل یہ ہے جناب، کہ ہمیں اغوا کیا گیا تھا۔ ہم اغوا کرنے والوں کی قید سے بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گئے ہیں — ظاہر ہے، انہوں نے ہماری جیبوں میں کچھ نہیں رہنے دیا ہوگا۔ اب آپ ہی بتائیں، ہم آپ کو کرایہ کہاں سے ادا کریں — پہلے تو پروگرام یہ تھا کہ یہاں سے گھر جائیں گے اور گھر پہنچ کر کرایہ ادا کر دیں گے، لیکن اب والد صاحب کو دیکھ کر ہمارا پروگرام بدل گیا ہے۔ ہم حیران ہیں، وہ ادھر کیا کرنے آئے ہیں۔"

"آپ اپنا پتا لکھوا دیں — کبھی میں اس طرف آیا تو کرایہ لے لوں گا۔" ڈرائیور نے کہا۔

"اس سے بہتر یہ ہوگا کہ آپ اپنا پتا لکھوا دیں، ہم منی آرڈر کر دیں گے۔"

"چلیے یونہی سہی۔" ڈرائیور مسکرا دیا اور پھر اپنا پتا لکھوا کر چلتا بنا۔

تینوں اس جگہ سے آگے بڑھے اور اس کوٹھی کے سامنے پہنچے، جس میں کار مڑی تھی — انہوں نے دیکھا، یہ وہی کوٹھی تھی، جس میں انہیں لے جایا گیا تھا اور جس میں سے وہ فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے تھے۔

عین اسی وقت انہوں نے دوڑتے قدموں کی آوازیں سُنیں،

وہ چونک کر اس سمت میں مڑے۔۔ ان کے پیچھے دوڑنے والے واپس آ رہے تھے۔ شاید وہ دوڑتے ہوئے بہت دور نکل گئے تھے۔

تلاشی

"ہائیں، آپ لوگ کہاں نکل گئے تھے۔ شاید ہماری تلاش میں کچھ زیادہ ہی دور پہنچ گئے ہوں گے۔ کیوں یہی بات ہے نا لیکن دیکھ لیجیے، ہم بھی آپ کے کتنے ہمدرد ہیں۔ کوٹھی سے زیادہ دور نہیں گئے؛ حالانکہ اگر چاہتے تو اب تک شاید اپنے گھر پہنچ چکے ہوتے۔" فاروق شوخ انداز میں کہتا چلا گیا۔

"یہ — یہ ہم کیا دیکھ رہے ہیں؟" ان میں سے ایک نے گویا اپنے ساتھیوں سے پوچھا۔

"تم لوگ ہم لوگوں کو دیکھ رہے ہو۔" فاروق نے جواب دیا۔

"خبردار، اب تم بھاگنے کی کوشش نہ کرنا۔" دوسرا غرایا۔

"ہم نے پہلے بھی کب بھاگنے کی کوشش کی ہے، جو اب کریں گے۔" فاروق بولا۔

"چلو اندر۔"

"ضرور کیوں نہیں، آئیے۔" فاروق نے قدرے چہک کر کہا۔

اور پھر ان کے آگے چلتے ہوئے اندر داخل ہو گئے۔ اسی وقت گیراج سے چند آدمی نکلتے نظر آئے۔ ان میں سب سے آگے ان کے والد تھے۔ ادھر ان لوگوں نے بھی انہیں دیکھ لیا اور ان کے منہ حیرت زدہ انداز میں کھل گئے۔

"ارے، محمود، فاروق، فرزانہ، یہ تم ہو۔" انسپکٹر جمشید کے منہ سے حیرت زدہ انداز میں نکلا۔

"جی ہاں، خدا کا شکر ہے کہ یہ ہم ہی ہیں۔ ہمارے فرشتے یا ہمزاد نہیں ہیں۔" فاروق نے کہا۔

"حیرت ہے، سارے شہر میں تمہاری تلاش ہو رہی ہے اور تم مجھے بغیر تلاش کیے ہی مل گئے۔" وہ بولے۔

"شاید اسی کو کہتے ہیں، دل کو دل سے راہ ہوتی ہے۔" فرزانہ بول اٹھی۔

"لیکن یہ تمہارے پیچھے کون لوگ ہیں؟"

"باس کے ساتھی — ہمیں اغوا کر کے یہیں لایا گیا تھا۔" محمود نے جلدی سے بتایا۔

"اوہو، اچھا — اور باس کون ہے؟" وہ حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔

"یہ جو آپ کے سامنے کھڑے ہیں۔"

"ارے، یہ — تمہارا مطلب ہے، آزاد راہی صاحب — کیوں راہی

صاحب — یہ میرے بچے کیا کہہ رہے ہیں؟"

"میرے ملازم مجھے باس ہی کہتے ہیں جناب، جہاں تک بات ہے اغوا کرنے کی، تو میں نے کسی کو بھی اغوا نہیں کیا۔"

"اور بقول آپ کے آپ کی کار بھی واقعی خراب ہے، اب یہ بے وقوفی تھی محترمہ سیمیں عرف زہرا بخاری کی کہ خراب کار ہی لے کر نکل کھڑی ہوئیں۔ واقعی، ہم سب غلط فہمی کا شکار ہو گئے ہیں، آؤ بھئی چلیں۔" آخری جملہ انہوں نے تینوں سے کہا۔

"جی — کیا فرمایا — چلیں — مگر ابا جان، ان لوگوں نے تو ہمیں قتل کرنے کی کوشش کی تھی۔"

"ارے نہیں بھئی، تمہیں غلط فہمی ہوئی ہو گی۔ یہ لوگ ایسے نہیں، آؤ چلیں۔"

"یہ — یہ آپ کیا فرما رہے ہیں؟" محمود دھک سے رہ گیا۔

"ٹھیک کہہ رہا ہوں، کہا جو ہے، چلو۔" ان کے لہجے میں سختی آ گئی — اور وہ تینوں ان کے پیچھے چلتے کوٹھی سے نکل آئے —

"خدا کا شکر ہے، تم ملے تو۔"

"اور ہم نے تو آپ کے بارے میں خبر سنی تھی، کہ جیپ سمیت بم سے اڑا دیے گئے۔"

"خبر کچھ غلط نہیں، لیکن مارنے والوں سے بچانے والا زیادہ طاقت ور ہے۔ خدا کی مہربانی سے میں اور تمہاری امی بال بال بچے

تھے، لیکن یہ سب باتیں گھر چل کر ہوں گی :

" لیکن ابا جان، آپ مجرموں کو کیوں چھوڑے جا رہے ہیں۔ اس وقت تو کوٹھی میں یہ ثبوت تک موجود ہے کہ وہ ہمیں ہلاک کرنا چاہتے تھے :

" اور وہ ثبوت کیا ہے ؟ " انسپکٹر جمشید رکتے ہوئے بولے ۔

" اندر تین ڈرم موجود ہیں، وہ ہمیں ان ڈرموں میں بند کر کے سمندر میں پھینکنے کا پروگرام بنا چکے تھے "

" یہ کیا ثبوت ہوا۔ کسی گھر میں بھی ایسے ڈرم ہو سکتے ہیں۔ چھوڑو، ہم پہلے گھر چلیں گے، ایک دوسرے سے حالات سُنیں گے۔ تب ہی مجرم کو گرفتار کرنے کے قابل ہو سکیں گے :

" تو پھر چلیے " محمود نے کندھے اچکائے ۔

گھر میں داخل ہوتے ہی ان کے کانوں سے خان رحمان اور پروفیسر داؤد کی آوازیں ٹکرائیں :

" یہ لیجیے بھابی، آ گئے ۔ ہم نے کہا تھا نا، جمشید اب انہیں لے کر ہی آئے گا "

" السلام علیکم، آپ لوگ کب آئے ؟ "

" بس جوں ہی یہ خبر ملی کہ ان تینوں کو اغوا کر لیا گیا ہے اور تم پر بھی بم پھینکا گیا ہے، دوڑے آئے " پروفیسر داؤد نے کہا

" بہت بہت شکریہ "

" ہائیں، اس میں شکریے کی کیا بات ہے " خان رحمان بولے :

وہ دونوں بیوی بچوں سمیت آئے تھے، لہٰذا گھر میں خوب رونق محسوس ہو رہی تھی، لیکن اس وقت انہیں ایک دوسرے کی کہانی سننے کی جلدی تھی، لہٰذا وہ اندرونی کمرے میں آ گئے اور انسپکٹر جمشید بولے :

" ہاں بھئی، اب شروع سے ساری کہانی سناؤ ۔ کوئی ایک بات بھی نہ رہنے پائے "

" جی بہتر " محمود نے کہا اور ٹونی کی ہلاکت کے واقعے سے لے کر باس کی کوٹھی سے فرار ہونے تک کے واقعات سنا ڈالے۔ اب انسپکٹر جمشید بولے :

" ہوں، میں بھی اپنے حالات تمہیں سنائے دیتا ہوں " یہ کہہ کر انہوں نے بھی ایک ایک بات بتا دی۔ ہوٹل آبشار میں جانے کی تفصیل بھی سنا دی۔

" اب جب کہ تمام حالات ہمیں معلوم ہو چکے ہیں، سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ کون سا ایسا دشمن ہے، جو ہمیں زندہ دیکھنا پسند نہیں کرتا۔ اس کا جواب ہے باس ۔ باس ہوٹل آبشار کا منیجر ہے۔ آخر اسے ہم سے کیا دشمنی ہو سکتی ہے۔ اب ہمیں اسے گرفتار کرنا ہی ہو گا، تاکہ اس سے پوچھ گچھ ہو سکے "

" لیکن آپ نے اسے اس وقت ہی گرفتار کیوں نہیں کیا ؟ "

محمود نے حیران ہو کر کہا۔

"اس وقت گرفتار کر کے کیا خاک مزا آتا۔ باقاعدہ پروگرام بنا کر گرفتار کریں گے۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

"چاہے اتنی دیر میں وہ ہمارے خلاف کوئی باقاعدہ پروگرام بنا لے۔" فاروق بولا۔

"فکر نہ کرو، دونوں صورتیں ہی پُر لطف رہیں گی۔ ہمارا پروگرام ان پر چل جائے یا ان کا ہم پر۔ کم از کم یہ تو معلوم ہو کہ یہ لوگ ہمارے پیچھے کیوں پڑ گئے ہیں۔ کیا تم نے ٹونی کے گھر کو اچھی طرح دیکھا بھالا تھا؟"

"جی ہاں، کیوں؟" محمود نے حیران ہو کر پوچھا۔

"میرا مطلب ہے، شاید اس نے کوئی وارث چھوڑا ہو اور اس کے بارے میں کوئی تحریر کسی محفوظ جگہ رکھ دی ہو۔ کیوں نہ ہم اس کے گھر کو ایک بار پھر دیکھ لیں۔"

"اگر آپ اس کی ضرورت محسوس کرتے ہیں تو چلے چلتے ہیں، ویسے تو ہم اپنا پورا اطمینان کر چکے ہیں۔" فاروق نے کہا۔

"پھر بھی اس میں حرج ہی کیا ہے، لیکن ٹھہرو، پہلے میں اکرام کو آزاد راہی اور اس کے ساتھیوں کی نگرانی کی ہدایات تو دے دوں۔"

فون کا رسیور اٹھا کر انہوں نے اکرام کو فون کیا اور ہدایات

دینے کے بعد انہیں لے کر باہر نکلے۔

"بھئی جمشید، یہ کیا، ہم تمہارے گھر آئے بیٹھے ہیں اور تم ان تینوں کو لے کر الگ کمرے میں گھس گئے ہو، یوں تو کام نہیں چلے گا۔" خان رحمان نے شکایت کی۔

"بالکل ٹھیک، اسی لیے ہم باہر آ گئے ہیں، لیکن معافی چاہتے ہیں، کیس ہی کچھ اس نوعیت کا ہے کہ ہم آرام نہیں کر سکتے۔ آپ لوگ کھائیں پئیں، بات چیت کریں، ہم ذرا ایک ضروری کام کر آئیں۔"

"لیجیے، پھر ضروری کام نکل آیا۔" بیگم جمشید نے بُرا سا منہ بنایا۔

"کیا کیا جائے امی جان، اب ان ضروری کاموں کو کون سمجھائے، چلے آتے ہیں سر اُٹھائے قطار در قطار۔" فاروق نے کہا اور سب بے ساختہ مسکرا دیے۔ مسکراہٹوں کے سائے میں وہ باہر نکل آئے اور کار میں بیٹھ کر ٹونی کے گھر پہنچے۔ انسپکٹر جمشید نے پولیس کی موجودگی کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ تالا کھولا اور اندر داخل ہو گئے۔

دوسرا لمحہ چونکا دینے والا تھا۔ ان کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی اور منہ کھلے کے کھلے رہ گئے۔

محمود، فاروق اور فرزانہ پولیس کی موجودگی میں اس گھر کا جائزہ لے چکے تھے۔ اس وقت گھر کے ہر کمرے میں گرد کی تہیں ضرور جمی ہوئی تھیں، لیکن چیزیں درہم برہم نہیں تھیں۔ الٹ پلٹ بھی نہیں تھیں۔ جائزہ لیتے وقت انہوں نے بھی کوئی بے ترتیبی نہیں پھیلائی تھی، لیکن اس وقت پورا گھر ایک کباڑ خانہ نظر آ رہا تھا — گھر کی ہر چیز الٹ پلٹ کر دی گئی تھی — تکیوں کے گدے تک پھاڑ دیے گئے تھے — صوفہ سیٹ ادھیڑ کر رکھ دیا گیا تھا۔ غرضیکہ کوئی چیز بھی صحیح سلامت نہیں بچی تھی۔ الماریاں چوپٹ کھلی تھیں۔ اور ان کی چیزیں فرش پر ڈھیر تھیں۔ یوں لگتا تھا جیسے کئی آدمیوں نے مل کر پورے گھر کی نہایت بے دردی سے تلاشی لی ہے — یہی وجہ تھی کہ وہ دم بخود تھے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کیا ہے۔

"ابا جان، یہ ہم کیا دیکھ رہے ہیں۔" محمود بڑبڑایا۔

"تلاشی کا منظر۔" فاروق بڑبڑایا۔

"اور یہ کسی ناول کا نام بھی ہو سکتا ہے۔" فرزانہ بھی بولے بغیر نہ رہ سکی — فاروق نے اسے کھا جانے والی نظروں سے گھورا۔

"حیرت ہے، ٹونی کے گھر کی تلاشی کس نے اور کیوں لی۔ کسی کو ایسا کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ تلاشی لینے والا کس چیز کی تلاش میں تھا۔" انسپکٹر جمشید نے سوچ میں گم لہجے میں کہا، پھر وہ ان سے کچھ کہے بغیر مکان سے نکل گئے۔ انہوں نے تینوں کو ساتھ آنے کے لیے نہیں کہا تھا۔ اس لیے وہ وہیں بتوں کی طرح کھڑے رہے۔ دس منٹ بعد ان کی واپسی ہوئی۔ گہری سوچ میں گم نظر آئے۔ آخر بولے:

"تم نے بتایا تھا کہ ٹونی کا حساب کتاب دو بنکوں میں ہے۔ میں نے ان دونوں بنکوں کے مینجروں کو فون کیا تھا۔ میں ان سے ٹونی کے بنک بیلنس کے بارے میں معلوم کرنا چاہتا تھا — تم یہ سن کر حیران ہو گے کہ ٹونی کے دونوں بنکوں میں لاکھوں روپے موجود ہیں اور بظاہر وہ کوئی کام کاج بھی نہیں کرتا تھا۔ کیمرے کی فلم وہ جس دکان سے حاصل کرتا تھا، ان سے تم لوگوں کی بات ہوئی تھی، جس سے ظاہر ہے کہ وہ فوٹوگرافی کا بہت شوقین تھا۔ تقریباً ہر روز ہی فلم خریدتا تھا۔ آخر کیوں، ایسا بھی کیا شوق، یہ شوق کوئی سستا شوق نہیں ہے۔ خیر، اس کے جواب میں تو یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ وہ کوئی غریب آدمی نہیں تھا، لیکن سوال تو یہ ہے کہ اس کے پاس اتنے پیسے کہاں سے آئے تھے۔ گھر کی تلاشی سے ثابت ہوتا ہے کہ تلاشی لینے والے کسی خاص چیز کی تلاش میں تھے۔ نہیں کہا جا سکتا، وہ چیز انہیں ملی یا نہیں۔ خیر سب سے پہلے تو ہم بھی اس گھر کی بغور تلاشی لیں گے۔ شاید وہ چیز ہمیں مل جائے، ان لوگوں کو نہ ملی ہو۔"

"تت، تت، تو کیا......" فاروق ہکلا کر رہ گیا۔

"ہوگئی اس کی تو زبان خراب" فرزانہ بولی۔

"غالباً فاروق یہ کہنا چاہتا ہے کہ تو کیا وہ کار دراصل ٹونی کو ہی کچلنا چاہتی تھی، اس کا نشانہ ہم نہیں تھے" محمود بولا۔

"اس کے سوا اب ہم کیا سوچ سکتے ہیں" فاروق نے کہا۔

"لیکن پھر، ابا جان پر حملہ کیوں کیا گیا۔ ہمیں کیوں اغوا کیا گیا۔ ہم سب کو جان سے مارنے کی کوشش کیوں کی گئی؟" فرزانہ جلدی جلدی بولی۔

"تاکہ ہم ٹونی کے معاملے میں نہ پڑیں" انسپکٹر جمشید بولے۔

"اوہ" ان کے منہ سے بے ساختہ انداز میں نکلا۔ آنکھوں میں حیرت دوڑ گئی۔

"گویا اصل مسئلہ صرف یہ ہے کہ کچھ لوگ ٹونی کو ہلاک کرنا چاہتے تھے۔ انہوں نے اسے کار کے ذریعے کچل دیا، لیکن اس کار کی لپیٹ میں ہم بھی آتے آتے بچے اور یہ سمجھ بیٹھے کہ کار والے ہمیں کچلنا چاہتے تھے، جب کہ بات یہ نہیں تھی۔ اس سلسلے میں ہمارے سامنے ہوٹل آبشار کا مینجر اور اس کے ساتھی آتے ہیں، گویا یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے ٹونی کو کچلا تھا، آخر کیوں؟ انہیں ٹونی سے کیا دشمنی تھی۔ ارے، ہم اس کیمرے کو تو بھول ہی گئے۔ وہ وہ ہم نے پولیس انسپکٹر کے حوالے کر دیا تھا، کیا خبر اس کیمرے

میں کوئی خاص بات ہو"

"ٹھیک ہے، ہم ابھی چل کر اسے دیکھتے ہیں، لیکن پہلے اس مکان کی تلاشی ضروری ہے"

انہوں نے مکان کے چپے چپے کی تلاشی شروع کی۔ انہیں کچھ پتا نہیں تھا کہ کیا چیز تلاش کر رہے ہیں۔ بس تلاشی میں محو تھے اور اس درجے گم، جیسے اس سے زیادہ دلچسپ کام انہیں کبھی ملا ہی نہ ہو۔ سارا مکان دیکھ ڈالا۔ الماریاں، میزوں کی درازیں، دریاں، قالین ہر چیز اپنی جگہ سے ہٹا کر دیکھ لی گئی۔ ایک کمرے میں انہیں لکڑی کی ایک سیڑھی رکھی ملی۔ انسپکٹر جمشید کی نظر اس کمرے کے روشن دان پر پڑی۔ یہ روشن دان انہیں عجیب سا لگا۔ روشن دان کے درمیان میں ایک لوہے کی سلاخ تھی اور لوہے کی سلاخ میں لکڑی کا موٹا سا تختہ فٹ تھا۔ یہ تختہ روشن دان پر فٹ آ جاتا تھا۔ ضرورت کے وقت اسے کھولا یا بند کیا جا سکتا تھا۔ انسپکٹر جمشید کو جو چیز عجیب لگی، وہ تختے کی موٹائی تھی۔ انہوں نے آج تک کسی روشندان میں اتنا موٹا تختہ نہیں دیکھا تھا، پھر کمرے میں لکڑی کی سیڑھی بھی موجود تھی۔۔ اس سیڑھی نے انہیں روشن دان کے بارے میں سوچنے پر مجبور کر دیا۔۔ آخر انہوں نے سیڑھی روشن دان کے نیچے لگائی اور اس پر چڑھ گئے۔ لکڑی کے تختے کا بغور جائزہ لیا تو اس کے درمیان میں ایک چھوٹا سا تختہ فٹ نظر آیا۔

"محمود، ذرا اپنا چاقو دینا۔" انہوں نے کہا۔

محمود نے جوتے کی ایڑی میں سے نکالا اور انہیں پکڑا دیا۔ اب جو انہوں نے چاقو کی نوک اس چھوٹے تختے میں اڑائی۔ تختہ یک دم کسی صندوق کے ڈھکنے کی طرح نیچے لٹکنے لگا اور بہت سی تصویریں کمرے کے فرش پر آ گریں۔ ان کے گرنے کی آواز انہیں اس لمحے بہت عجیب لگی۔ انسپکٹر جمشید جلدی سے نیچے اتر آئے۔ محمود فرش پر بکھری تصویروں کو دیکھتے ہوئے بولا:

"تو یہ ہے وہ چیز۔ جس کی تلاش میں پورے مکان کو الٹ پلٹ کر ڈالا گیا۔"

چال کی ابتدا

"ہاں، انہی تصویروں کے لیے ٹونی کو ہلاک کیا گیا۔ انہی تصویروں کے لیے تلاشی لی گئی، لیکن ٹونی نے ان کے لیے عجیب وغریب جگہ بنائی تھی۔ اگر اس کمرے میں مجھے سیڑھی کی موجودگی عجیب نہ محسوس ہوتی تو شاید روشن دان کا موٹا تختہ بھی مجھے اپنی طرف متوجہ نہ کر پاتا۔ ان تصویروں کو سمیٹ لو محمود۔ ہم ان کا جائزہ گھر جا کر لیں گے۔ ان پر انسانی خون کے چھینٹے لگے ہیں۔" انسپکٹر جمشید جذباتی آواز میں کہتے چلے گئے۔

گھر پہنچے تو خان رحمان اور پروفیسر داؤد ابھی تک موجود تھے۔ انہیں دیکھ کر سب لوگ اٹھے۔

"اس کا مطلب ہے، اب تم لوگ بالکل فارغ ہو کر آئے ہو اور ہم آپس میں کچھ وقت گزار سکیں گے۔" پروفیسر داؤد نے بچوں کی طرح چہکتے ہوئے کہا۔

"افسوس پروفیسر صاحب، ہم ایک عجیب وغریب کیس میں الجھے

ہوئے ہیں۔ اب پہلی بار ہمارے ہاتھ ایک اہم چیز لگی ہے۔ ذرا ہم اس کا جائزہ لیں گے اور دیکھیں گے کہ ہم اس سے کیا فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔"

"اوہ، خیر کوئی بات نہیں۔" انہوں نے کہا اور وہ ایک بار پھر اسی کمرے میں بند ہو گئے۔

"ہم شروع سے غلط فہمی کا شکار رہے ہیں، یہ خیال کرتے رہے کہ ہمارے کچھ دشمن ہمیں جان سے مار ڈالنا چاہتے ہیں، لیکن بات یہ نہیں تھی، دشمنوں کا نشانا ٹونی تھا۔ الجھ ہم بھی گئے۔ جب دشمنوں نے دیکھا کہ ہم لوگ اس معاملے میں شامل ہو گئے ہیں اور اپنی فطرت کے مطابق اب اس معاملے کی تہہ تک پہنچے بغیر دم نہیں لیں گے تو انہیں یہی بہتر معلوم ہوا کہ ہمیں بھی راستے سے ہٹا دیا جائے۔ اس غرض کے لیے ایک طرف تو تم تینوں کو اغوا کیا گیا، دوسری طرف ہم پر بم مارا گیا، لیکن خدا کو ابھی ہماری زندگی منظور تھی، اس لیے ہم زندہ سلامت یہاں موجود ہیں۔ اب ذرا نکالو ان تصویروں کو۔ دیکھیں تو سہی، وہ کیا بلا ہیں۔"

محمود نے تصویریں نکالیں اور میز پر پھیلا دیں۔

"ارے، اس قسم کی تصویریں تو ہم ٹونی کے گھر میں پہلی مرتبہ بھی دیکھ چکے ہیں۔" محمود نے چونک کر کہا۔

"وہ تصاویر اہم نہیں ہوں گی۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"جی ہاں، ضرور یہی بات ہے۔" فاروق نے سر ہلایا۔

اب وہ ایک ایک تصویر کو غور سے دیکھنے لگے، دیکھتے چلے گئے۔ یہاں تک کہ چاروں نے ہر ایک تصویر دیکھ ڈالی۔ اس کام سے فارغ ہو کر تینوں خالی خالی نظروں سے اپنے والد کی طرف دیکھنے لگے۔

"حیرت ہے، ان میں تو کوئی تصویر بھی اہم نہیں۔ سب عام سی تصویریں ہیں، مزدور پیشہ لوگوں کی تصویریں۔ بڑھیوں، لوہاروں اور موچیوں کی تصویریں۔ آخر ٹونی نے ان تصویروں کو اس قدر خفیہ جگہ کیوں رکھا ہوا تھا۔" محمود نے حیران ہو کر کہا۔

"ہمیں ان تصویروں کو اور غور سے دیکھنا چاہیے۔ ان کی کوئی نہ کوئی اہمیت ضرور ہے۔"

ایک بار پھر وہ ایک ایک تصویر کو بغور دیکھنے لگے۔ اچانک انسپکٹر جمشید زور سے چونکے۔ ان کے چہرے پر حیرت کے گہرے بادل نظر آئے۔ آنکھوں میں تیز چمک لہرائی، پھر ان کے منہ سے نکلا:

"اف میرے خدا، تو یہ بات ہے۔"

"کیا بات ہے ابا جان، کچھ ہمیں بھی بتائیے۔" فرزانہ بے چین ہو کر بولی۔

"لو، خود ہی دیکھ لو۔" انہوں نے مسکرا کر کہا اور ہاتھ میں پکڑی تصویر ان کی طرف بڑھا دی۔ فرزانہ نے تصویر ان سے

جھپٹ لی اور پھر تینوں ایک ساتھ اس پر جھکے اور کچھ اس بے خبری میں جھکے کہ سر زور سے ٹکرائے۔ وہ تو خیر ہوئی۔ آس پاس بیگم جمشید موجود نہیں تھیں، ورنہ یہ ضرور پوچھتیں:

"کیا توڑا؟"

اور انہیں کہنا پڑتا، ناریل — ان کی نظریں تصویر پر جم گئیں: یہ ایک موچی کی تصویر تھی — وہ فٹ پاتھ پر بیٹھا تھا۔ اس کے سامنے جوتیاں گانٹھنے کا سامان پڑا تھا۔ بائیں ہاتھ میں ایک جوتی تھی۔ دائیں ہاتھ میں کیلیں ٹھونکنے والا لوہے کا آلہ تھا — اس آلے پر اس کا ہاتھ ایک مکے کی صورت میں جما ہوا تھا۔ وہ چند سیکنڈ تک اس تصویر کو بغور دیکھتے رہے، پھر محمود نے کہا:

"ابا جان، افسوس، ہم تو کچھ بھی نہیں سمجھے، یہ کس کی تصویر ہے؟"

"پہلے ان سب تصویروں کا جائزہ لے لو، شاید اس آدمی کی اور تصویریں بھی ہوں۔"

انہوں نے پھر تصویروں کو دیکھنا شروع کیا اور اس شخص کی تین اور تصویریں نکالنے میں کامیاب ہو گئے۔ یہ بھی فٹ پاتھ پر جوتیاں گانٹھنے کے سامان کے ساتھ اتاری گئی تھیں۔ ان تصاویر میں وہ کوئی جوتی نہیں گانٹھ رہا تھا — ہونٹوں کی حرکت سے محسوس ہوتا تھا، کسی سے بات کر رہا ہے۔ ایسے میں بھی اس کا

دایاں ہاتھ مکے کی صورت میں تھا۔

"چار تصویریں ہو گئیں، لیکن ہم اب بھی نہیں جان سکے کہ یہ کس کی تصویریں ہیں۔"

"تم جان بھی کس طرح سکتے ہو، کیونکہ تم نے تو اسے دیکھا ہی نہیں۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

"تت، تو کیا آپ دیکھ چکے ہیں؟"

"ہاں، اس تصویر کو دیکھتے ہی میرے ذہن میں تو پورا معاملہ صاف ہو گیا ہے اور اب میرا ذہن مجرم کو جال میں پھانسنے کی ترکیب سوچ رہا ہے۔ میں اسے اس طرح پھانس لینا چاہتا ہوں کہ دنیا کا بڑے سے بڑا وکیل بھی اسے نہ بچا سکے۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"ہمارے پلے تو کچھ نہیں پڑا۔ کیا آپ وضاحت نہیں کریں گے؟"

"ہاں، کیوں نہیں، لیکن بہتر ہو گا کہ تم کچھ دیر صبر کرو۔ میں ابھی ایک چال چلوں گا اور مجرم جال میں آ جائے گا، پھر میں سب کے سامنے اس کے چہرے سے نقاب الٹ دوں گا۔ تم لوگوں پر بھی ساری حقیقت واضح ہو جائے گی۔"

"بہت بہتر، جیسے آپ کی مرضی۔" انہوں نے ایک ساتھ کہا۔

"تو ٹھیک ہے، تم ذرا اپنے انکلز اور دوستوں کے ساتھ بیٹھو۔ میں ابھی آتا ہوں۔"

"گویا آپ چال کی ابتدا کرنے والے ہیں۔"

"ہاں، یہی سمجھ لو۔" وہ بولے اور وہ تینوں باہر نکل آئے۔ ان کے نکلتے ہی انسپکٹر جمشید نے فون کا ریسیور اٹھایا اور کسی کے نمبر ڈائل کرنے لگے۔

(۱۰)

رات کی تاریکی میں ایک سایا ٹونی کے مکان کی طرف بڑھ رہا تھا۔ دروازے پر پہنچ کر اس نے چابیوں کا گچھا جیب سے نکالا اور تالا کھولنے کی کوشش میں مصروف ہو گیا۔ تین منٹ بعد تالا کھل گیا اور وہ اندر داخل ہو گیا۔ اب اس نے ٹارچ روشن کر لی اور ایک ایک کمرے کو دیکھتے ہوئے آگے بڑھنے لگا۔ آخر ایک کمرے میں داخل ہوا اور بجلی کا بٹن دبا دیا۔ کمرے میں روشنی پھیل گئی۔ اس نے چاروں طرف دیکھا اور پھر سیڑھی اٹھا کر روشندان کے نیچے کھڑی کر دی۔ دوسرے ہی لمحے وہ جلدی جلدی اوپر چڑھ رہا تھا۔ یہاں تک کہ اس نے روشن دان والی سلاخ کو پکڑ لیا اور دوسرے ہاتھ سے چاقو جیب سے نکال کر کھولا۔ چاقو کمانی دار تھا۔ اس کے کھلنے کی کڑکڑاہٹ کمرے میں گونج کر رہ گئی۔ چاقو کی نوک اس نے تختے میں پھنسائی، دوسرے ہی لمحے خانہ کھل گیا اور اس میں سے

بہت سی تصویریں نکل کر نیچے گر پڑیں۔ اس نے روشن دان کو جوں کا توں چھوڑا اور جلدی جلدی نیچے اترا۔ تصویریں سمیٹ کر جیبوں میں ٹھونسیں اور کمرے کے دروازے کی طرف بڑھا۔ اس کے ساتھ ہی کئی کیمروں کی فلش لائٹیں چمک اٹھیں اور وہ ٹھٹک کر رک گیا۔

"معاف کیجیے گا جناب، آپ کو چونکنا پڑا۔" انسپکٹر جمشید کی آواز کمرے میں گونج اٹھی اور پھر وہ ایک کھڑکی کے پردے کے پیچھے سے نمودار ہوتے نظر آئے۔ ان کے ساتھ ہی غسل خانے میں سے محمود، فاروق، فرزانہ کے علاوہ کئی بڑے بڑے آفیسر بھی باہر نکل آئے۔ دوسری دو کھڑکیوں کے پیچھے سے چار فوٹوگرافر نکل کر سامنے آ گئے۔ یہ منظر دیکھ کر کمرے میں موجود شخص بھونچکا رہ گیا۔ اس کا رنگ ہلدی کی طرح زرد پڑ گیا۔

"آذر بیگ صاحب، آپ کے ہوش کیوں گم ہو گئے۔ اوہ اچھا، شاید آپ یہ سوچ رہے ہیں کہ ہم لوگ یہاں کس طرح پہنچ گئے۔ دراصل بات یہ ہے کہ آپ کو ان تصویروں کے بارے میں فون آپ کے غیر ملکی دوستوں اور ہمدردوں نے نہیں، میں نے کیا تھا۔ میں نے فون پر کہا تھا کہ میں آپ کا غیر ملکی ہمدرد بول رہا ہوں۔ تصویریں کوٹھی کے سیڑھی والے کمرے کے روشن دان میں موجود ہیں۔ اس روشن دان میں لکڑی کا ایک موٹا تختہ فٹ ہے، جسے چاقو کی نوک

سے کھولا جا سکتا ہے، لہٰذا پہلی فرصت میں وہ تصویریں نکال لی جائیں،
ایسا نہ ہو کسی دشمن کے ہاتھ لگ جائیں۔ آپ نے ان تصویروں
کے لیے آزاد راہی یا کسی اور کو بھیجنا مناسب نہیں سمجھا۔ خود تشریف
لے آئے۔ یہ ہمارے حق میں اور بھی اچھا ہے۔ ہم آپ کو اس
طرح رنگے ہاتھوں پکڑنے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ حالات اور واقعات
کی کڑیاں ملانے کے بعد میں بآسانی اس نتیجے پر پہنچ گیا تھا کہ
ٹونی ایک بہت چالاک بلیک میلر تھا۔ وہ ایک بہت اچھا فوٹو
گرافر بھی تھا۔ اس نے فوٹو گرافی کے ذریعے بلیک میلنگ کا کام
شروع کیا اور ایک مدت تک نہایت خاموشی سے کام کرتا رہا۔ وہ
وہ بہت چھوٹے لوگوں مثلاً مزدوروں، بڑھیوں، لوہاروں اور موچیوں
وغیرہ کی تصاویر کھینچ کر اپنے پاس محفوظ رکھ لیتا اور جب بھی اس کا
کوئی شکار شہرت حاصل کر لیتا، بڑا آدمی بن جاتا تو ٹونی اسے
بلیک میل کرنے کے قابل ہو جاتا۔ وہ اسے خط لکھتا کہ تم پہلے صرف
ایک موچی تھے یا مزدور تھے، فلاں جگہ، فلاں فٹ پاتھ پر بیٹھا کرتے
تھے۔ آج تمہاری شہرت آسمان سے باتیں کر رہی ہے۔ ایسے میں اگر
تمہاری اس زمانے کی تصاویر عوام کے سامنے لائی جائیں تو تمہاری
ساری عزت خاک میں مل جائے اور تمہیں خوب ہی طعنے ملیں۔ لہٰذا
اگر تم چاہتے ہو کہ تمہاری عزت بنی رہے تو مجھے اتنی رقم ہر ماہ ادا
کیا کرو۔ رقم کی ادائگی کے لیے وہ اپنا ایک بنک اکاؤنٹ نمبر بتا دیتا

ہوگا۔ اس طرح اس کے اکاؤنٹ میں رقوم جمع ہوتی رہتی ہوں گی۔
اس نے کام بہت آسان چنا تھا اور ہماری قوم کی نفسیات کو خوب
سمجھنے کے بعد شروع کیا تھا، کیوں کہ وہ جان گیا تھا۔ جھوٹی
عزت کے متوالے یہ بتانا پسند نہیں کرتے کہ وہ ماضی میں کیا تھے۔
یعنی صرف ایک مزدور، گوالے، موچی یا لوہار وغیرہ تھے، لہٰذا ہر
ممکن کوشش کرتے ہیں کہ کسی کو یہ معلوم نہ ہو کہ وہ ماضی میں کیا
تھے۔ بس یہ ثابت کرنے پر تلے رہتے ہیں کہ وہ تو خاندانی آدمی ہیں،
یہ ہیں اور وہ ہیں۔ حقیقت پر پردہ ڈالنے کے لیے انہیں سو جھوٹ
بھی بولنا پڑیں تو بلا جھجک کے بول جاتے ہیں۔ ٹونی نے ایسے ہی
لوگوں کو بلیک میل کرنے کا پروگرام بنایا تھا۔ وہ عام لوگوں کی
تصویریں اتارتا رہتا اور انہیں محفوظ رکھتا۔ ان میں سے اگر کوئی کسی
اونچے مقام پر پہنچ جاتا تو وہ اسے بلیک میل کرنے لگتا۔ مسٹر آذر بیگ
بھی اس کے شکاروں میں سے ایک تھے۔ یہ کسی زمانے میں موچی
تھے۔ فٹ پاتھ پر بیٹھ کر جوتیاں گانٹھا کرتے تھے۔ اس زمانے میں
ٹونی نے ......" ان کے الفاظ درمیان میں رہ گئے۔ اسی وقت محمود
نے اعتراض کر ڈالا۔

"لیکن ابا جان، ٹونی تو اتنا بوڑھا آدمی نہیں تھا، جب کہ
آذر بیگ بہت عرصہ پہلے جوتیاں گانٹھتے تھے جیسا کہ تصویر سے
ظاہر ہے، پھر یہ کیسے ممکن ہے۔"

اس کا سیدھا سادا جواب یہ ہے کہ اسے یہ کام اپنے باپ
سے ملا ہوگا۔ اس کا باپ بھی غالباً یہی کام کرتا رہتا تھا اور ٹونی کے
کام باپ کے زمانے کی تصاویر آتی رہی ہوں گی۔ اس کی اتاری
ہوئی تصاویر شاید اس کے بڑھاپے میں بلیک میل کا سہارا بنتیں۔
ہاں تو اگر ٹونی نے نہیں تو پھر اس کے باپ نے آذر بیگ کی
تصاویر اتاری ہوں گی۔ آج جب کہ آذر بیگ شہرت کی بلندیوں
پر ہے اور قومی اسمبلی کے الیکشن میں بھی حصہ لینے والا ہے۔ اگر
کوئی یہ ثابت کر دے کہ وہ تو ایک موچی تھا تو اس کی بنی بنائی
عزت خاک میں مل جائے اور شاید وہ الیکشن میں بھی کامیاب نہ ہو
سکے۔ اس لحاظ سے ٹونی نے اسے بلیک میل کرنے کا بہت اچھا
وقت چنا تھا، لیکن ادھر معاملہ اور تھا۔ آذر بیگ دراصل ہمارے
دشمن ملک کی انگلیوں پر ناچ رہا ہے۔ اسے ان کی طرف سے مدد
مل رہی ہے، ہر قسم کی مدد۔ کیونکہ دشمن ملک آذر بیگ اور
اس جیسے کچھ اور لوگوں کو بھی حکومت میں شامل کر دینا چاہتا ہے،
تاکہ حکومت میں کچھ حصہ اس کا بھی ہو اور آگے چل کر کام آئے۔
دوسرے لفظوں میں آذر بیگ ہمارے دشمن ملک کے ایجنٹ بھی
ہیں۔ یہ اس بات سے ثابت ہے کہ ان کے آدمیوں نے میری جیپ
پر جو بم مارا، وہ غیر ملکی ساخت کا تھا، بلکہ ماہرین کا کہنا ہے کہ خاص
طور پر ہمارے دشمن ملک کا ہے۔ ان حالات میں میرا ہوشیار ہو

جانا ضروری تھا، لہٰذا میں نے ایک لمحے کے لیے بھی آرام نہیں
کیا اور برابر اس کیس پر کام کرتا رہا۔ اگر یہ معاملہ صرف ہماری
دشمنی تک ہی ہوتا تو مجھے اس کی زیادہ پروا نہ ہوتی، لیکن ایسے
لوگوں کا حکومت میں شامل ہونا ملک اور قوم کے لیے زہر کے برابر
ہے۔ بس یہی ہیں کل حالات، اتنا اور بتا دوں کہ ہوٹل آبشار کے
مالک بھی یہ خود ہی ہیں، لیکن اس بات کا علم صرف مینیجر آزاد راہی
کو ہے۔"

"اس کا مطلب ہے، ٹونی نے انہیں بھی بلیک میل کرنے
کی کوشش کی تھی، لیکن انہوں نے رقم ادا کرنے کی بجائے اپنے
آدمی اس کے پیچھے لگا دیے اور انہیں حکم دے دیا کہ ٹونی کو
ختم کر دیا جائے۔ پارک کے پچھلے حصے میں جب ٹونی فلم خرید
کر پیدل چل پڑا تو ان کے آدمیوں کو حملہ کرنے کا موقع مل گیا۔
حالانکہ اس نے آذر بیگ کو یہ دھمکی بھی دی ہوگی کہ تصاویر اس نے
کسی دوست کے پاس رکھی ہوئی ہیں اور یہ کہ اگر اسے کچھ ہو
گیا تو اس کا دوست فوراً تصاویر اخبار میں شائع کرا دے گا، لیکن
آذر بیگ نے اسے صرف دھمکی خیال کیا۔ ویسے بھی اس قسم کے
لوگ ایسی چیزیں کبھی کسی دوست کے پاس نہیں رکھتے۔ اس طرح
ان کا راز کھل جاتا ہے، لہٰذا آذر بیگ نے یہ اندازہ بالکل درست
لگایا تھا کہ تصاویر اس کے کسی دوست کے پاس نہیں ہیں، بلکہ

اس نے اپنے پاس ہی کہیں چھپا رکھی ہیں: چنانچہ انہوں نے ٹونی کا کانٹا ہی نکال دینے کا پروگرام بنا لیا اور آزاد راہی کو حکم دیا کہ ٹونی کو ختم کر دیا جائے۔۔ اسے تو ختم کر دیا گیا، لیکن اس معاملے میں محمود اور فاروق شامل ہو گئے۔ یہ اطلاع جب مسٹر آذر بیگ کو لگی تو انہوں نے ہمیں بھی ختم کر دینے کا حکم دیا، کیونکہ یہ جانتے تھے کہ جب ہم کسی معاملے میں پڑ جائیں تو اس کی تہہ تک پہنچے بغیر نہیں رہ سکتے۔ اس طرح یہ چکر شروع ہوا اور اختتام کو پہنچا، لہٰذا مسٹر آذر بیگ کو ہم گرفتار کر رہے ہیں۔ آزاد راہی اور اس کے ساتھیوں کو بھی بغیر کسی دقت کے گرفتار کر لیا جائے گا۔ کیونکہ ان کی نگرانی پہلے سے ہی جاری ہے۔" یہاں تک کہہ کر انسپکٹر جمشید خاموش ہو گئے۔۔ اکرام ہتھکڑی لیے آذر بیگ کی طرف بڑھنے لگا۔

"چلے تھے ہمیں ڈرموں میں بند کر کے سمندر میں غرق کرنے اور ہمیں دوسری دنیا کی سیر کرانے۔۔ یہ معلوم نہیں تھا کہ خود انہیں ایک لمبے سفر پر روانہ ہونا پڑے گا۔۔ یہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر۔ ویسے یہ بھی گھٹیا پن کی انتہا ہے کہ انسان اپنی اصل حقیقت کو بھول جائے۔ موچی، لوہار، مزدور یا بڑھئی ہونے میں کیا عیب ہے؟ یہ بات تو فخر سے بیان کرنی چاہیے کہ فلاں زمانے میں میں صرف یہ تھا، نہ کہ یہ تھا اور وہ تھا۔ آپ کا کیا خیال ہے حاضرین؟"

اس نے ڈرامائی انداز میں کہا۔

حاضرین مسکرا کر رہ گئے۔

آزاد راہی کے گھر سے انسپکٹر جمشید کے تمام کاغذات وغیرہ اور ان تینوں کے کھلونے برآمد کر لیے گئے۔ گھر کی طرف جاتے ہوئے فرزانہ نے پوچھا:

"ابا جان، آپ نے ایک دُوربین کا ذکر بھی تو کیا تھا، جو زہرا بخاری عرف سیمی کی کار کی پچھلی سیٹ پر رکھی تھی، پھر وہ آپ کو اگلی سیٹ پر نظر آئی تھی۔۔ اس کا کیا چکر تھا؟"

"ہاں، وہ۔۔ وہ دراصل وائرلیس کی قسم کا کوئی آلہ تھا۔ وہ اس کے ذریعے اپنے باس سے رابطہ قائم کیے ہوئے تھی۔" انہوں نے کہا۔

"میرا بھی یہی خیال تھا۔" محمود نے کہا۔

"ویسے ابا جان، بلیک میلنگ کا اندازہ تو ہم نے تصویریں ملنے کے بعد ہی لگا لیا تھا، لیکن چونکہ ہم نے آذر بیگ کو دیکھا نہیں تھا، اس لیے تصویر دیکھ کر جان نہ سکے کہ وہ کس کی تصویر ہے۔" فاروق نے کہا۔

"چلو مان لیا، تم بہت عقلمند ہو اور اگر تم نے آذر بیگ کو دیکھ رکھا ہوتا تو تصویر دیکھتے ہی سمجھ جاتے، بس یہی سننا چاہتے تھے نا۔" فرزانہ طنزیہ لہجے میں بولی۔

"کیا گھر سے انگارے چبا کر چلی تھیں؟" فاروق نے حیران ہو کر کہا، پھر فوراً ہی بولا:

"لیکن ان دنوں اتنی سردی تو نہیں ہے۔"

"اب تم سے کون مغز مارے۔" فرزانہ نے بھنا کر کہا۔

"تمہارے علاوہ کون مارے گا۔" فاروق نے مسمسی صورت بنا کر کہا اور انسپکٹر جمشید اور محمود مسکرانے لگے۔

فرزانہ ابھی تک فاروق کو کھا جانے والی نظروں سے گھور رہی تھی۔

اشتیاق احمد کی زندگی کا دوسرا ناول

آستین کا سانپ

- یہ ناول دس سال پہلے لکھا گیا تھا۔
- فیروز سنز جیسے معروف ادارے سے شائع ہوا۔
- اشتیاق احمد کا اس سے پہلے صرف ایک ناول پیکٹ کا راز شائع ہوا تھا۔
- اب جب کہ دس سال گزر چکے ہیں، تو قانون کی رو سے اس کے حقوق اشاعت اشتیاق احمد کو مل گئے ہیں، لہذا اب یہ شاہکار ناول:

ادارہ اشتیاق پبلی کیشنز سے شائع ہو رہا ہے۔

ماہ جنوری کے شوکی سیریز کے ساتھ پڑھیے!

آستین کا سانپ پر بھی ۲۰۰/- روپے کا نقد انعام۔
اشتیاق احمد کا منتخب کردہ جملہ لکھ کر بھیجیے۔ سب سے پہلے موصول ہونے والے جملے پر مبلغ ۲۰۰/- روپے کا نقد انعام پیش کیا جائے گا۔

قیمت : ۵/۵۰

آیندہ ناول کی ایک جھلک:

ساتواں عظیم الشان خاص نمبر ۹۷

محمود، فاروق، فرزانہ، انسپکٹر جمشید اور
آفتاب، آصف، فرحت، انسپکٹر کامران مرزا

سلاٹر کی واپسی

مصنف : اشتیاق احمد

- انسپکٹر کامران مرزا کو ایک پُراسرار خط ملا تھا۔
- اس بار ان کی ملاقات آغاز میں ہی ہو جاتی ہے اور کن حالات میں — آپ ہنسے بغیر نہیں رہ سکیں گے۔
- اس دلچسپ ترین ملاقات سے خوفناک حالات شروع ہو گئے —

مشرقی پہاڑیاں خون اگل رہی تھیں۔

اس ماہ کے ناول
۹۵ سوزانی درندہ (انسپکٹر جمشید سیریز) ۶/-
۹۶ غول در غول (" ") ۶/-
۳۰ مظلوم قاتل (انسپکٹر کامران مرزا سیریز) ۶/-
۱۱ انصاف کا خون (شوکی سیریز) ۶/-
آئندہ ماہ کے ناول
ساتواں عظیم الشان خاص نمبر؟
۹۷- سلاٹر کی واپسی (مشترکہ کارنامہ) ۱۰/-
شوکی سیریز کا پہلا عظیم الشان خاص نمبر
۱۲- انسانی دھواں ۱۲/-
۱۴- آستین کا سانپ (انسپکٹر کامران مرزا سیریز) ۵/۵۰